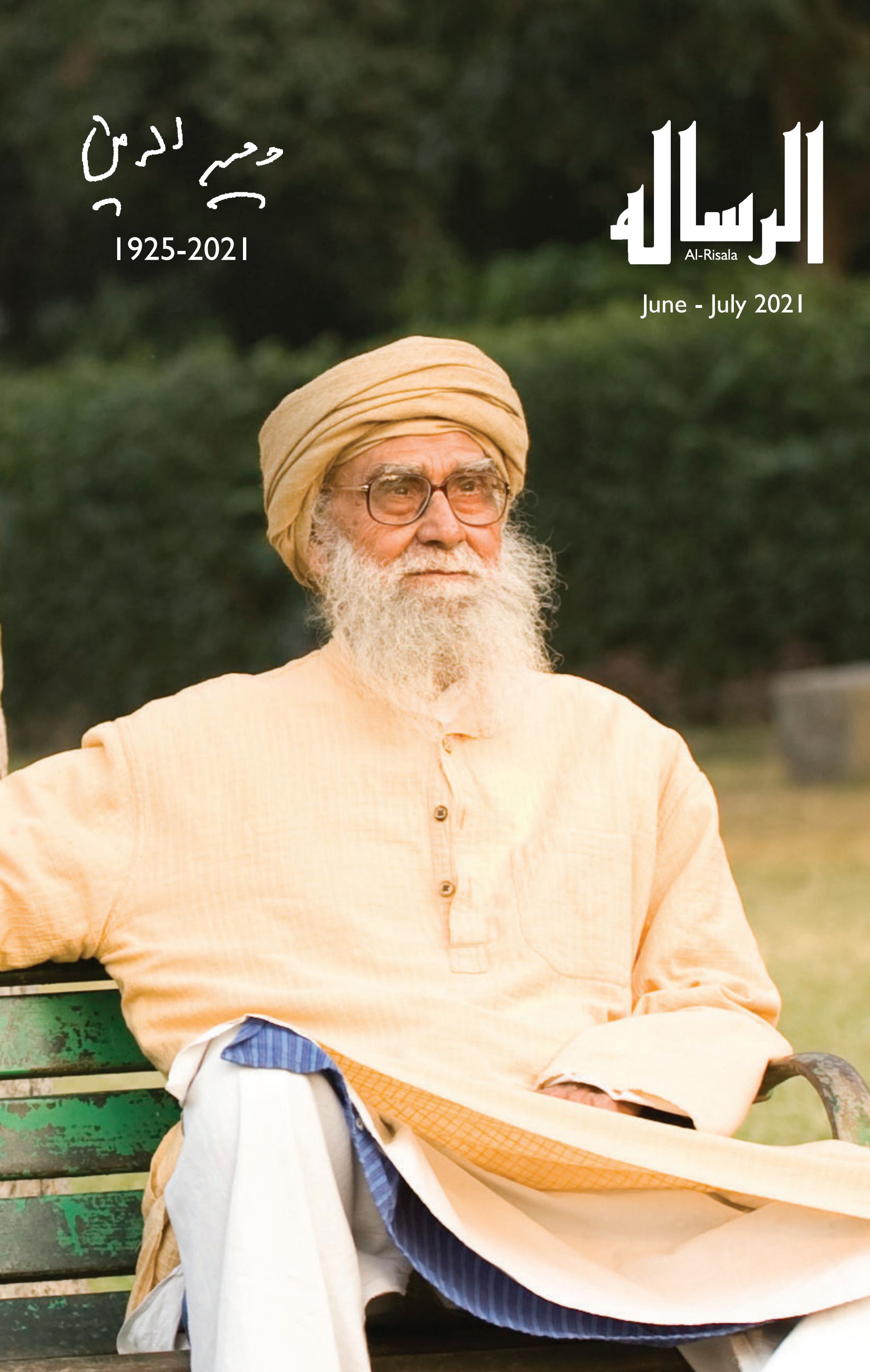


الرسالہ
Al-Risala

June - July 2021

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

June - July 2021 | Volume 46 | Issue 6-7

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: +91-8588822679
Tel. 011-41827083
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 30 per copy
Subscription by Book Post	₹ 300 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/c No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000
Nizamuddin West Market Branch

Paytm
Mobile: 8588822679

To order books by Maulana Wahiduddin Khan, please contact Goodword Books
Tel. 011-41827083, Mobile: +91-8588822672
Email: sales@goodwordbooks.com

Goodword Bank Details
Goodword Books
State Bank of India
A/c No. 30286472791
IFSC Code: SBIN0009109
Nizamuddin West Market Branch

تحریر
مولانا وحید الدین خاں

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi. Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd., A46-47, Sector 5, Noida-201301. Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan. Total Pages:52

دعا کی قبولیت

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کردیتا ہے، وہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک بندۂ مومن کے لیے عظیم تسکین (solace) کا سامان موجود ہے۔ اس میں ایک مومن بندے کے لیے دعا کا ایک اہم پوائنٹ آف ریفرنس ہے۔ بندہ اللہ رب العالمین سے ایک چیز کا طالب ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا اس کے معاملہ کو سنبھالنے والا بن جائے۔ اِس آیت کو لے کر ایک بندۂ مومن کہہ سکتا ہے— خدایا، میں آخری حد تک ایک عاجز انسان ہوں، لیکن قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ تیری رحمت بہت وسیع ہے۔ خدایا، تو نے میرے گناہوں کے بارے میں یہ فرمادیا ہے کہ تو خود اس کو معاف فرمائے گا۔ اب میں جو دعا کررہا ہوں تو کیا تو میری دعا کو ریجکٹ کردے گا۔ یعنی جب تو بندوں کے معاملے میں اتنا فیاض ہے کہ بغیر مانگے ہوئے تو اعلان کررہا ہے کہ تو ان کے گناہوں کو معاف فرمائے گا تو جب میں خود سے سوال کررہا ہوں تو کیا تو اس کو پورا نہیں فرمائے گا۔

سب سے بڑی دعا وہ ہے جو حقیقی پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) کے حوالے سے کی جائے۔ جس انسان کو شعوری طور پر اِس حقیقت کی دریافت ہوجائے، وہ پکار اٹھے گا کہ خدایا، میں کامل طور پر عاجز انسان ہوں، لیکن تو نے اپنی رحمت سے بلا استحقاق مجھے یک طرفہ طور پر تمام چیزیں عطا کی ہے، موت کے بعد بھی دوبارہ میں اپنے آپ کو کامل طور پر عجز کی حالت میں پاؤں گا۔ خدایا، جس طرح تو نے موت سے پہلے کی زندگی میں میرے عجز کی کامل بھرپائی کی، اسی طرح تو موت کے بعد کی زندگی میں بھی میرے عجز کا مکمل بدل عطا فرما، میرے تمام گناہوں کو اپنی رحمت سے معاف کردے۔

کسٹم میڈ یونیورس

حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: مَنْ أَصْبَحَ مُعَافًى فِي بَدَنِهِ، آمِنًا فِي سِرْبِهِ، عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ، فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيرِهَا (حلیۃ الاولیاء، جلد 5، صفحہ 249)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: جس نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ جسمانی طور پر صحت والا ہو، اپنے مسکن میں مامون ہو، اور اس کے پاس اس دن کی روزی ہو، تو گویا اس کے لیے پوری دنیا جمع کردی گئی۔

میں روزانہ صبح کو جب اپنے آفس سے نکل کر باہر بیٹھتا ہوں، تو سچ مچ واقعۃً محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا میرے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ہر چیز میری خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ غذا، پانی، آکسیجن، وغیرہ تمام چیزیں مکمل طور پر میری خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ گویا یہ یونیورس انسان کے لیے ایک کسٹم میڈ یونیورس ہے۔ وہ انسان کی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ اس حقیقت پر اگر انسان غور کرے تو وہ کبھی نیگیٹیو تھنکنگ کا شکار نہ ہو۔ وہ ہمیشہ نعمتوں کے احساس میں جینے لگے۔ اس کی زبان پر ہمیشہ شکر کا کلمہ جاری رہے۔ حتی کہ انسان ایک گلاس پانی پیتا ہے، اور وہ جسمانی نظام کے تحت ہضم ہو کر باہر نکل جاتا ہے تو اس پر اس کو شکر ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر چیز جو اس دنیا میں انسان کو ملتی ہے اس پر شکر کا جذبہ پیدا ہونا بالکل نیچرل بات ہے۔ مثلاً غذا، ہوا کے ذریعے آکسیجن کا ملنا، پانی کی مسلسل سپلائی کا جاری رہنا، وغیرہ۔ اگر انسان سوچے تو یہ تمام چیزیں ہر وقت اللہ رب العالمین کی نعمت کو یاد دلاتی ہیں۔

اسی طرح مذکورہ حدیث میں ہے کہ وہ اپنے سِرب (گھر) میں مامون ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پرامن سوچ یا مثبت سوچ کے ساتھ اپنے دن کی ابتدا کرے۔ اس دنیا کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کے لیے جو چانس ہے، وہ دوسروں سے ایڈجسٹ کرتے ہوئے اپنے معاملات کو مینج (manage) کرنا ہے۔ اس کو یہ کرنا ہے کہ وہ پرامن انداز میں پیش آنے والے چیلنج کا مقابلہ کرے۔ اسی حقیقت کو مذکورہ حدیث میں "مسکن میں مامون ہونا" کہا گیا ہے۔

دین پر عمل

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: لَيَحْمِلَنَّ شِرَارُ هَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى سَنَنِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ أَهْلِ الْكِتَابِ حَذْوَ الْقُذَّةِ بِالْقُذَّةِ (مسند احمد، حدیث نمبر 17135)۔ یعنی اس امت کے شرارت پسند لوگ پچھلے اہل کتاب کے طریقے کو اپنائیں گے، جیسے ایک تیر دوسرے تیر کی طرح ہوتا ہے۔ اس حدیث کے مطابق، مسلمان اپنے بگاڑ کے زمانے میں وہی کریں گے، جو یہود و نصاری نے اپنے بگاڑ کے زمانے میں کیا تھا۔ البتہ یہاں ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ پچھلے پیغمبروں کا لایا ہوا خدائی پیغام محفوظ نہیں۔ اس کے برعکس، پیغمبر اسلام کا لایا ہوا قرآن پوری طرح محفوظ ہے، آپ کی سنت بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ اس طرح یہ امکان ہمیشہ باقی رہے گا کہ قرآن وسنت کے مطالعہ سے دین محمدی کو دوبارہ دریافت کیا جائے، اور اس کو اصل صورت میں اختیار کیا جائے۔ قرآن وسنت کا محفوظ ہونا، اس بات کی گارنٹی ہے کہ مجموعے کی سطح پر خواہ بگاڑ آجائے، لیکن افراد کی سطح پر ہمیشہ امت میں ایسے افراد موجود رہیں گے، جو اصل دین کو دوبارہ دریافت کرکے مکمل طور پر اس کی پیروی کریں۔

موجودہ دور میں زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ میڈیا میں اپنا وقت گزاریں۔ بے خوف دل کے ساتھ لوگوں سے بحثیں کریں۔ آپ کا سارا کنسرن میڈیا کی خبریں ہو، نہ کہ قرآن وحدیث میں بیان کردہ باتیں۔ اس قسم کے لوگوں کا ذہنی شاکلہ (mindset) میڈیا کی خبروں کی بنیاد پر بنے گا، نہ کہ قرآن اور سنت کی بنیاد پر۔ یہی وہ لوگ ہیں، جو پچھلی قوموں کی پیروی کرتے ہیں۔

دوسری شکل یہ ہے کہ تعاہد بالقرآن (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5033) آپ کی مصروفیت ہو، یعنی قرآن وحدیث میں غور وفکر آپ کے دن رات کا عمل بنا ہوا ہو۔ آپ قرآن کے معانی کو سمجھنے میں اپنے صبح وشام گزارتے ہوں۔ آپ قرآن وحدیث میں گہرا غور وفکر کرنے والے بنے ہوئے ہوں۔ اس طرح مطالعہ اور غور وفکر کے نتیجے میں آپ پر قرآن کے اور حدیث کے نئے نئے معانی کھلیں، اور پھر آپ ان کو اپنی زندگی میں اپنا رہنما بنالیں۔ یہی لوگ حقیقی معنوں میں ربانی انسان ہیں۔

دجال کا دور

صعب بن جثامۃ بن قیس لیثی (وفات 25ھ) ایک صحابی ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ :لَا يَخْرُجُ الدَّجَّالُ حَتَّى يَذْهَلَ النَّاسُ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ(معجم الصحابہ، جلد2، صفحہ8)۔یعنی صعب بن جثامہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے سنا، آپ نے کہا: دجال نہیں نکلے گا، یہاں تک کہ لوگ اللہ عزوجل کے ذکر سے غافل ہوجائیں گے۔

مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک دور کا نام ہے، جب کہ گمراہی بہت پھیل جائے گی۔ وہ گمراہی یہ ہوگی کہ لوگوں کے ذہن سے خدا کی معرفت ختم ہوجائے گی۔ اس غفلت کا سبب ایسے خیالات یا نظریات ہوں گے، جس پر بظاہر اسلام کا لیبل لگا ہوگا، مگر وہ اسلام سے دور کرنے والے ہوں گے۔

دجالیت کا دور وہ ہے، جب کہ دنیا میں پروفیشنل ایجوکیشن کا دور دورہ ہوگا۔ یعنی وہ ایجوکیشن جس کے ذریعے افراد کو ہنرمند بنایا جائے۔ مثلاً تجارت، نرسنگ، انجنیئر نگ اور قانون، وغیرہ۔ لیکن وہ علم جس سے معرفت میں اضافہ ہو، وہ کم یاب ہوجائے گا۔ لوگ پیسہ کمائیں گے، لیکن سچے علم سے بے خبر ہوں گے۔ لوگوں کی جیبیں بھری ہوں گی، اس بنا پر وہ بہت بولیں گے، بہت زیادہ بحثیں کریں گے۔ بظاہر علم کا چرچا ہوگا، لیکن یہ چرچا مادی انٹرسٹ کے لیے ہوگا، نہ کہ اللہ کی معرفت میں اضافہ کے لیے۔

یہ وہ زمانہ ہوگا، جب کہ مال کی کثرت کی وجہ سے لوگ نفس پرستی میں مبتلا ہوجائیں گے۔ جھوٹ کی کثرت ہوگی۔ سچائی کو ماننے کا مزاج کم ہوجائے گا۔ اس کے برعکس، اپنی بات منوانے والوں کی کثرت ہوجائے گی۔ سنانے والے بہت ہوجائیں گے، لیکن سننے والے موجود نہ ہوں گے۔ پیسے کی افراط کی بنا پر لوگ اِن سنسیر ٹی (insincerity) میں مبتلا ہوجائیں گے۔ ہر آدمی اپنے ہی کو سب کچھ سمجھے گا۔ دوسرے کی بات سننا، اور اس پر غور کرنا، یہ مزاج دنیا سے ختم ہوجائے گا۔

عورت اور مرد کا فرق

انگریز مستشرق ایڈورڈ ولیم لین(Edward William Lane, 1801-1876)ایک برطانوی مستشرق، مترجم اور لغت نگار(lexicographer) تھا۔ وہ انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں مہارت رکھتا تھا۔ عربی زبان کے ڈیٹا کے لیے اس نے مصر میں کئی برس قیام کیا۔ اس نے ایک کتاب منتخب ترجمۂ قرآن(Selections from the Kuran) تیار کی۔ جو پہلی بار لندن سے 1843 میں چھپی۔ اِس کتاب کے دیباچے میں لین نے لکھا تھا — اسلام کا تباہ کُن پہلو عورت کو حقیر درجہ دینا ہے:

The fatal point in Islam is the degradation of woman. (p. 90)

مستشرق لین نے 1843 میں جو بات کہی تھی۔ اُس سے اس کی خاص مراد یہ تھی کہ اسلام کے قانونِ شہادت(evidence) میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر مانا گیا ہے۔ یہ دونوں صنفوں کے درمیان کُھلی ہوئی نابرابری ہے۔ اِس کے بعد بطور مسلّمہ یہ بات مان لی گئی کہ اسلام عہدِ جاہلیت کا مذہب ہے، وہ سائنسی دَور کا مذہب نہیں بن سکتا۔

اسلام کے خلاف یہ نظریہ ڈیڑھ سو سال تک چلتا رہا۔ اس کے بعد مختلف اسباب سے سائنسی حلقوں میں یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ عورت اور مرد کے دماغ کے بارے میں دوبارہ ریسرچ کی جائے، اور یہ معلوم کیا جائے کہ کیا دونوں کی دماغی بناوٹ میں کوئی فرق ہے۔ اِس ریسرچ کا ایک ریزن یہ سوال تھا کہ ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان لَو میریج(love marriage) ہوتی ہے اور پھر بیش تر واقعات میں ایسا ہوتا ہے کہ دونوں لڑ بھڑ کر ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔

اِس سلسلے میں بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور اداروں کے تحت، سائنسی انداز میں بہت سی ریسرچز کی گئیں۔ یہاں تک کہ خالص سائنسی ریسرچ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ عورت اور مرد کے دماغ میں فطری بناوٹ کے اعتبار سے ایسا فرق پایا جاتا ہے، جس کو بدلنا ممکن نہیں۔ وہ فرق یہ ہے کہ مرد

پیدائشی طور پر سنگل ٹریک مائنڈ (single-track mind) کا حامل ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں عورت فطری طور پر ملٹی ٹریک مائنڈ (multi-track mind) رکھتی ہے۔ بی بی سی انگریزی ویب سائٹ پر چھپی رپورٹ 24 اکتوبر 2013 کے مطابق—

Women 'better at multitasking' than men, study finds
It is not a myth - women really are better than men at multitasking, at least in certain cases, a study says... says co-author Dr Gijsbert Stoet, of the University of Glasgow, "Multitasking is getting more and more important in the office, but it's very distracting, all these gadgets interrupting our workflow."

www.bbc.com/news/science-environment-24645100
(accessed on 07.04.2021)

یعنی ریسرچ کے مطابق، عورتیں ایک وقت میں کئی ذمے داریوں کی انجام دہی میں مردوں سے بہتر ہیں۔ یہ کوئی فرضی بات نہیں ہے۔ عورتیں ملٹی ٹاسک کے، کم از کم، کچھ معاملوں میں مردوں سے بہتر ہیں... گلاسگو یونیورسٹی کے ڈاکٹر گز برٹ اسٹائٹ کہتے ہیں کہ آفس میں ملٹی ٹاسک زیادہ سے زیادہ بہتر ہے، لیکن یہ ڈسٹریکٹ کرتا ہے، یہ طریقہ کام کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

مرد و عورت کے درمیان یہ فرق اتنا عام ہے کہ اس کو ہر گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی گھر جہاں پر عورت اور مرد دونوں اکٹھے رہتے ہوں وہاں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مرد کا ذہن کسی ایک پوائنٹ پَر متوجہ رہے گا۔ جب کہ عورت کا یہ حال ہوگا کہ اس کا ذہن ایک ہی وقت میں کئی چیزوں کی طرف متوجہ رہے گا۔ مثلاً مرد اگر ایک کتاب پڑھ رہا ہے تو اس کا سارا دھیان کتاب میں لگا رہے گا۔ حتی کہ پاس کے کمرے میں اگر ٹیلی فون کی گھنٹی بجے تو وہ اس کو سننے سے قاصر رہے گا۔ حالاں کہ اسی کمرے میں بیٹھی ہوئی عورت دوسرے کمرے میں بجنے والی ٹیلی فون کی گھنٹی کو بخوبی طور پر سن لے گی۔

عورت کے ذہن اور مرد کے ذہن کا یہ فطری فرق بتاتا ہے کہ گواہی کے قانون میں دونوں کے درمیان فرق رکھنے کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک واقعہ جس کو عورت اور مرد دونوں دیکھ رہے ہوں اس کو مرد جب دیکھے گا تو وہ اس کو یکسوئی (concentration) کے تحت دیکھے گا۔

اِس بنا پر وہ اس قابل ہوگا کہ واقعے کے تمام اَجزاء اس کے حافظے میں محفوظ ہوسکیں۔ اس کے مقابلے میں عورت اپنے ذہن کی فطری بناوٹ کی بنا پر چیزوں کو سرسری انداز میں دیکھے گی۔ اس کے ذہن کا ایک حصہ واقعے کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کے ذہن کا دوسرا حصہ کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہوجائے گا۔ اِس بنا پر ایک گواہ عورت کے ساتھ دوسری گواہ عورت رکھی گئی تاکہ دونوں مل کر واقعے کی پوری تصویر بنا سکیں۔

مذکورہ سائنسی تحقیق کی روشنی میں قرآن کی متعلقہ آیت زیادہ قابلِ فہم بن جاتی ہے۔ یہ آیت قرآن میں اِس طرح آئی ہے: وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى (2:282)۔ یعنی تم اپنے مردوں میں سے دو مَردوں کو گواہ بنالو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، اُن لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تاکہ اگر ایک عورت (گواہی دینے میں بھول) چوک جائے تو دوسری عورت اس کو یاددہانی کرادے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں ضَلَّ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ضَلّ کے معنی عربی زبان میں اِدھر اُدھر بھٹکنے (go astray) کے ہوتے ہیں۔ یہ لفظ اِس معاملے میں عَین سائنسی ہے۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اگر مذکورہ آیت کا مفہوم متعین کیا جائے تو وہ یہ ہوگا — اگر ذہنی بناوٹ کی بنا پر ایک عورت کی توجہ اصل واقعے سے کچھ ہٹ جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا کر پہلی عورت کی کمی پوری کردے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت اِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن عالم الغیب کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے۔ خدائے عالم الغیب نے اپنے علم کلّی کی بنا پر دونوں صنفوں کے درمیان فطری فرق کو اُس وقت جانا جب کہ عام انسان اِس فرق سے بالکل ناواقف تھا۔ اِس علم کی بنا پر خدا نے گواہی کا مذکورہ اُصول مقرر کیا۔ مذکورہ آیت اِس بات کا ایک علمی ثبوت ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو ابدی صداقت کی حامل ہے۔ قرآن خدائے برتر کی کتاب ہے، نہ کہ عام معنوں میں کوئی انسانی کتاب۔

ڈی لنکنگ — ایک سنتِ رسول

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت وہ ہے، جس کو پالیسی آف ڈی لنکنگ (policy of delinking) کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مکہ میں آپ نے اپنا مشن شروع کیا۔ اس وقت مکہ اہل شرک کے قبضے میں تھا۔ انھوں نے کعبہ کو 360 بتوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ رسول اللہ نے یہ کیا کہ کعبہ میں آنے والے زائرین اور اس میں موجود بتوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا۔ یعنی بت پرستی اور کعبہ کے قریب بت پرستوں کے اجتماع میں فرق کرنا۔ اس طرح ڈی لنکنگ پالیسی اختیار کرنے کی بنا پر آپ کے لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ مکمل طور پر مثبت ذہن کے ساتھ اپنا مشن، دعوت الی اللہ کا عمل انجام دے سکیں۔ اگر آپ ڈی لنکنگ پالیسی اختیار نہ کرتے تو یہ فائدہ کبھی حاصل نہ ہوتا۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کو صحابی رسول عمرو بن العاص (وفات 43ھ) کے قول سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کا قول یہ ہے: لَيْسَ الْعَاقِلُ الَّذِي يَعْرِفُ الْخَيْرَ مِنَ الشَّرِّ، وَلَكِنِ الْعَاقِلُ الَّذِي يَعْرِفُ خَيْرَ الشَّرَّيْنِ (المجالسۃ وجواہر العلم، اثر نمبر 670)۔ یعنی عقل مند وہ نہیں ہے، جو خیر کے مقابلے میں شر کو پہچانے۔ بلکہ عقل مند وہ ہے، جو یہ جانے کہ دو شر کے درمیان خیر کیا ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ شر کے مختلف پہلوؤں کو ڈی لنک کر کے دیکھا جائے تو شر کے اندر بھی خیر کا پہلو مل جائے گا۔ آپ نے کعبہ میں بت اور بت پرستوں کے معاملے میں جو طریقہ اختیار کیا، وہ کیا تھا۔ ان بتوں کا ظاہری پہلو یہ تھا کہ وہ شرک کا ذریعہ تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انھی بتوں کی وجہ سے وہاں لوگ جمع ہوتے تھے، اور اس کی وجہ سے وہاں ایک آڈینس بنتا تھا۔ رسول اللہ نے یہ کیا کہ بتوں کے مشرکانہ پہلو کو الگ کر دیا، اور بتوں کی وجہ سے وہاں آنے والے لوگوں کو اپنے لیے بطورِ آڈینس استعمال کیا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہر عسر کے ساتھ یسر کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ انسان اگر مثبت ذہن کے ساتھ معاملے میں غور کرے تو ہر عسر میں اس کو یسر کا پہلو مل جائے گا۔

انیسویں صدی میں انگریز جب انڈیا میں آئے تو انھوں نے مسلمانوں کو بہت سی چیزیں دیں۔

مثلاً انگریزی ایجوکیشن، جس کی وجہ سے مسلمان اس قابل ہوئے کہ وہ انڈیا کے باہر کی دنیا کو دیکھ سکیں۔ لیکن سارے مسلمانوں نے انڈیا میں اینٹی برٹش تحریک چلادی۔ اسی طرح آزادی کے بعد جو حکومت آئی اس نے بھی مسلمانوں کو بہت کچھ دیا۔ لیکن دوبارہ مسلمانوں کو حکومت سے شکایت پیدا ہوگئی، وغیرہ۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مسلم لیڈران زندگی کے ایک اصول کو نہیں جانتے ہیں۔ مسلم قائدین اس فطری قانون کو نہیں جانتے کہ ہر عسر کے ساتھ یسر موجود ہوتا ہے (الانشراح، 94:5-6)۔ عسر کا مطلب ہے پرابلم، اور یسر کا مطلب موقع (opportunity)۔ یعنی پرابلم کے درمیان موجود مواقع کو جاننا، اور منصوبہ بند انداز میں ان کو اویل (avail) کرنا، یہی زندگی کا اصول ہے۔ لیکن مسلم لیڈروں نے اس اصول کو نہ پہلے جانا، اور نہ وہ اب اس کو جانتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ایک کام کیا ہے۔ وہ ہے اویلیبل مواقع کو نظر انداز کرنا، اور جو چیز اویلیبل نہیں ہے، اس کے اوپر تحریک چلانا۔ یہی غیر حقیقی طریقِ کار ہر دور میں مسلمانوں پر غالب رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے ہر دور میں صرف کھویا، کسی بھی دور میں وہ پانے والی چیز کو پانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

قرآن کی سورہ البقرہ میں زندگی کی ایک حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو (2:155)۔ توسیعی اعتبار سے حکومت کا ملنا، اور اس کا ہاتھ سے نکلنا، وغیرہ بھی اس میں شامل ہے۔ اور صبر کا مطلب ہے پرابلم کو اگنور کرنا، مواقع کو اویل (avail) کرنا۔

انسان پر زندگی کے جو مختلف مرحلے پیش آتے ہیں، وہ ایک موقع کے طور پر پیش آتے ہیں۔ زندگی کو جاننے والا شخص وہ ہے، جو زندگی کو ایک موقع کی صورت میں دریافت کرے، اور پھر منصوبہ بند انداز میں اس موقع کو استعمال کرے۔ مشکل حالات منفی چیز نہیں۔ مشکل حالات یا چیلنج کسی انسانی گروہ کو تخلیقی گروہ بناتا ہے۔ جب کسی گروہ کے اندر ایسی حالت پیدا ہو، تو انسان اس کو فطرت کا تحفہ سمجھے، اور ڈی لنکنگ کا طریقہ اختیار کرکے وہ اس کو بطور موقع اویل کرے۔ اس طرح نان کریٹو گروہ کریٹیو (creative) گروہ بن جائے گا۔

دشمن سے سیکھنا

1949ء میں جاپانیوں نے اپنے یہاں ایک صنعتی سیمینار کیا۔ اس سیمینار میں انہوں نے امریکا کے ڈاکٹر ایڈورڈ ڈیمنگ (Dr Edward Deming) کو خصوصی دعوت نامہ بھیج کر بلایا۔ ڈاکٹر ڈیمنگ نے اپنے لیکچر میں اعلیٰ صنعتی پیداوار کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ کوالٹی کنٹرول (quality control) کا نظریہ تھا۔ (ہندوستان ٹائمس 28 دسمبر 1986ء)

جاپان کے لیے امریکہ کے لوگ دشمن قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکا نے جاپان کو بدترین شکست اور ذلت سے دوچار کیا تھا۔ اس اعتبار سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ جاپانیوں کے دل میں امریکا کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکے۔ مگر جاپانیوں نے اپنے آپ کو اس قسم کے منفی جذبات سے اوپر اٹھالیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ امریکی پروفیسر کو اپنے سیمینار میں بلائیں اور اس کے بتائے ہوئے فارمولا پر ٹھنڈے دل سے غور کرکے اس کو دل وجان سے قبول کرلیں۔

جاپانیوں نے امریکی پروفیسر کی بات کو پوری طرح پکڑ لیا۔ انہوں نے اپنے پورے انڈسٹری کو کوالٹی کنٹرول کے رخ پر چلانا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے صنعت کاروں (industrialist) کے سامنے بےنقص (zero-defect) کا نشانہ رکھا۔ یعنی ایسی پیداوار مارکیٹ میں لانا جس میں کسی بھی قسم کا کوئی نقص نہ پایا جائے۔ جاپانیوں کی سنجیدگی اور ان کا ڈیڈیکیشن (dedication) اس بات کا ضامن بن گیا کہ یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو۔ جلد ہی ایسا ہوا کہ جاپانیوں کے کارخانے بےنقص سامان تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ یہ حال ہوا کہ برطانیہ کے ایک دکاندار نے کہا کہ جاپان سے اگر میں ایک ملین کی تعداد میں کوئی سامان منگاؤں تو مجھ کو یقین ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی نقص والی نہیں ہوگی۔ چنانچہ تمام دنیا میں جاپان کی پیداوار پر صد فیصد بھروسہ کیا جانے لگا۔

اب جاپان کی تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ حتی کہ وہ امریکا کے بازار پر چھا گیا، جس کے ایک ماہر کی تحقیق سے اس نے کوالٹی کنٹرول کا فارمولا حاصل کیا تھا — اس دنیا میں بڑی کامیابی وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو ہر ایک سے سبق سیکھنے کی کوشش کریں، خواہ وہ ان کا دوست ہو یا ان کا دشمن۔

کریٹیو عمل

اہل ایمان کے عمل کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کو پڑھیں، پھر اس پر عمل کریں۔ مثلاً یہ کہ پانچ وقت نمازیں پڑھنا، اور رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا، وغیرہ۔ ایک اور خاص عمل یہ ہے کہ ایک شخص غور وفکر کر کے کوئی مطلوب عمل دریافت کرے، اور اس کو روبعمل لانے کی پلاننگ کرے۔ اس دوسرے عمل کو کریٹیو عمل کہہ سکتے ہیں۔ اجتہادی عمل اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک کریٹیو عمل ہے۔ ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: إِذَا اجْتَہَدَ الْحَاكِمُ فَأَخْطَأَ، كَانَ لَهُ أَجْرٌ، وَإِذَا اجْتَہَدَ فَأَصَابَ، كَانَ لَهُ أَجْرَانِ (مسند ابو یعلیٰ، حدیث نمبر 228)۔ یعنی جب حاکم اجتہاد کرے اور اس کا وہ حکم درست نہ ہو تو اس کو ایک اجر ملے گا اور اگر اس نے اجتہاد کیا اور اس میں وہ درستگی کو پہنچ گیا، تو اس کے لیے دہرا اجر ہے۔

اجتہادی عمل یا کریٹیو عمل کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ کرنے والا اس میں غلطی کرے تب بھی اس کو ایک ثواب ہے، اور اگر اجتہاد درست ہو تو دہرا ثواب ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ لوگوں کے اندر تخلیقی عمل کے لیے زیادہ سے زیادہ شوق (incentive) پیدا ہو۔ کریٹیو عمل میں آدمی کو بہت زیادہ جد و جہد کرنی پڑتی ہے، اس لیے اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے قرآن و حدیث اور موجودہ حالات پر غور کیا، اس کے بعد اس کو یہ دریافت ہوئی کہ موجودہ زمانے میں ایک انٹرنیشنل زبان وجود میں آئی، جس کے ذریعے انٹرنیشنل تبلیغ کے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہ یہ کرے کہ انٹرنیشنل زبان میں قرآن کا معیاری ترجمہ تیار کرے، اور اس کو ساری دنیا میں پھیلائے تو یہ کریٹیو عمل ہوگا۔ عام عمل کا بھی ثواب ہے، لیکن کریٹیو عمل کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ تخلیقی عمل کا خاص تعلق دعوتی عمل سے ہے۔ دعوت میں تخلیقی عمل کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ مثلاً اگر آپ قرآن کی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلانا چاہیں تو اس کے لیے بہت زیادہ تخلیقی فکر کو کام میں لانا پڑے گا۔ تخلیقی عمل کے بغیر کوئی بڑا دعوتی کام انجام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

ڈر، پست ہمتی

ایک قاری الرسالہ لکھتے ہیں: میرے ایک ساتھی ہیں جو جنوبی ہند میں دعوتی کام کرتے ہیں۔ آج کل وہ بیمار ہیں، میں ان کی عیادت کے لیے گیا تھا۔ دورانِ گفتگو انھوں نے اپنا تاثر بتایا کہ جب ہم ٹیم کی شکل میں 1998 میں شمالی ہند کے دعوتی دورے پر گئے۔ تو اس وقت مختلف شخصیات اور اداروں میں جانے کا موقعہ ملا تا کہ دعوتی کام کا تعارف ہو، اور ہمیں اچھا مشورہ اور حوصلہ ملے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سفر میں تقریباً سارے ہی افراد نے ہمیں ڈرایا، اور پست ہمت کیا، اور کہا کہ دعوتی کام کے لیے حالات ناسازگار ہیں۔ اس میں صرف ایک شخصیت کا استثنا تھا، وہ مولانا وحید الدین خاں صاحب ہیں۔ انھوں نے ہماری ہمت افزائی کی ، اور ہمیں مفید مشورے سے نوازا۔ مولانا ہمارے یہ ساتھی بہت ہی ایکٹیو داعی ہیں، انھوں نے کہا کہ میں آج کل بیماری کے ایام میں خود احتسابی (self-introspection) کی زندگی گزار رہا ہوں ۔انھوں نے مزید کہا کہ میں کنفیوزن کا شکار ہوں، اور اس کی وجہ کیا ہے، اب تک مجھے اس کا جواب نہیں ملا۔

جب میں ان سے مل کر واپس آ گیا تو انھوں نے یہ پیغام بھیجا: " آپ میری عیادت کے لیے آئے ، اور مجھے دعاؤں کے ساتھ بہت کچھ دے کر گئے۔ جب سے میں بیمار ہوا ہوں، اپنے اور اپنی دعوتی ٹیم کے سلسلے میں بہت سوچتا رہتا ہوں کہ ہم نے بیس سال کا عرصہ لگا کر کیا حاصل کیا؟ ہمارا رخ کدھر ہے۔ کیا ہم دعوت اور ریٹائڈ زندگی گزار رہے ہیں، دعوت کے نام پر ہم کیا کیا کام کر رہے ہیں، وغیرہ، وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ میں ان کے جوابات کی تلاش میں ہوں، کسی سوال کا کچھ جواب ملتا ہے، کسی کا نہیں، خیر ساری چیزیں اپنی ڈائری میں لکھ رہا ہوں ، کیا پتہ میرے رب کی طرف سے دوبارہ موقع ملے تو میں اپنی اصلاح کروں۔" مولانا جب انھوں نے آپ کی شخصیت کا اعتراف بطور داعی کے کیا، پھر بھی اپنے مقصد اور مشن کو لے کر کنفیوزن کا شکار ہیں، اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کچھ علما اعتدالِ فکری کے نام پر کنفیوزن کا شکار رہتے ہیں۔ اس لیے وہ" دعوت

بھی کرے گا اور عداوت (دشمنی) بھی کرے گا" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس، متعین رہنمائی پر اگر کوئی چلے تو اس کو شخصیت پرستی کا نام دیتے ہیں، یہی ان کا ذہنی انتشار ہے۔ اس پر کچھ رہنمائی فرمائیں۔

جواب

پچھلے سو سال سے زیادہ مدت کے اندر مسلمانوں میں بہت سی تحریکیں اٹھی ہیں۔ بظاہر ان کے نام مختلف ہیں، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے سب کا محرک ایک تھا، اور وہ تھا ردعمل۔ یہ تمام تحریکیں ردعمل (reaction) کی تحریکیں تھیں۔ دورِ جدید کی مختلف تحریکوں کو انھوں نے اسلام کے لیے اور مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھا، اور وہ اس کے خلاف بطورِ دفاع اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے علم کے مطابق ان میں سے کوئی تحریک حقیقی معنوں میں اللہ اور آخرت اور جنت کے لیے نہیں اٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کہیں نہ کہیں منفی نفسیات موجود تھی۔ اسی منفی نفسیات کا سبب ہے کہ بظاہر وہ کوئی بھی نام لیں، مثلاً دعوت یا تبلیغ۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ردعمل کی تحریکیں تھیں، اور جو تحریک بطور ردعمل کے اٹھے، اس کے اندر وہی کمی پائی جائے گی، جس کی نشاندہی آپ کے ساتھی نے کی ہے۔

قرآن کی تعلیمات کے مطابق، مسلمان کی حیثیت شاہد کی ہے، اور دوسرے اقوام کی حیثیت مشہود کی (85:3)۔ یعنی دوسرے الفاظ میں مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق ہو، تو لوگوں کے اندر دوسری قوموں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ پروان چڑھے گا۔ اس کے برعکس، اگر حریف اور رقیب کا تعلق ہو، تو مسلمان منفی ذہنیت کا شکار ہو جائیں گے، دوسری قوموں کے بارے میں وہ خیر خواہی کے انداز میں نہیں سوچ پائیں گے۔ جب کہ پیغمبر اپنی مدعو قوم سے کہتے تھے: وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ (7:68)۔ یعنی میں تمھارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔ پیغمبر شعیب نے کہا تھا: وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ (7:79)۔ یعنی میں نے تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی بھلائی چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو، اس کے باوجود میں نے یک طرفہ طور پر تمھارے ساتھ خیر خواہی کی۔

اس منفی مزاج کی بنا پر مسلمانوں میں مختلف قسم کی بے راہ روی پیدا ہوئی۔ اسی بنا پر یہ تحریکیں

مسلمانوں کے اندر صحت مند مزاج بنانے میں بری طرح فیل ثابت ہوئی ہیں۔ حتی کہ تجربہ بتاتا ہے کہ لوگ بظاہر خواہ مختلف قسم کے داعیانہ الفاظ بولیں، لیکن ان کے اندر سے داعیانہ جذبہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے ان تحریکوں سے وابستہ افراد سے ملیے تو بہت جلد وہ ظلم اور سازش کے الفاظ بولنے لگتے ہیں، جس کو مذکورہ ملاقات میں ڈر اور پست ہمتی کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس صورتِ حال سے محفوظ رہنے کا راستہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ ہے کہ پچھلی غلطیوں کا اعتراف کیا جائے، اور دوبارہ مثبت انداز میں دعوت الی اللہ کی منصوبہ بندی کی جائے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ان کو احساس ہوتا ہے کہ ماضی میں غلطی ہوئی، تب بھی وہ کھل کر اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ غلطی کا اعتراف کیے بغیر کچھ نیا کام کیا جائے۔ مگر اس قسم کا کام کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ غلط سرگرمیوں کے زمانے میں جو ذہن بنا ہے، اس کو اعلان کے ساتھ ترک کرنا ضروری ہے۔ اگر اعلان کے ساتھ ترک نہ کیا جائے، تو ممکن ہے کہ اس کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں۔

نیز یہ کہ آپ کے دوست نے کچھ افراد کے حوالے سے جو یہ بات کہی ہے کہ انھوں نے ہمیں ڈرایا، اور پست ہمت کیا، اور کہا کہ دعوتی کام کے لیے حالات ناسازگار ہیں۔ ایسے لوگوں پر حضرت عائشہ کا یہ قول ثابت آتا ہے کہ انھوں نے قرآن وحدیث پڑھا، مگر انھوں نے قرآن وحدیث نہیں پڑھا (أُولَئِكَ قَرَءُوا، وَلَمْ يَقْرَءُوا) مسند احمد، حدیث نمبر 24609۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث سے عام طور پر صرف کچھ چھوٹے چھوٹے مسئلے نکالے جاتے ہیں، جن کو جزئی (فروعی) مسائل کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، حدیث میں ابدی رہنمائی کا جو پہلو تھا وہ امت کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا۔ یہ حدیث کی تصغیر (underestimation) ہے۔ حدیث یا سنتِ رسول سے سب سے بڑی چیز دریافت کرنے کی یہ ہے کہ رسول اللہ نے مسائل کو مواقع میں کنورٹ کیا۔ حدیث کو پڑھنے والے حدیث سے سب کچھ نکالتے ہیں، مگر اس قسم کی ابدی حکمت ابھی تک نہیں نکال پائے۔ ان کے موجودہ منفی ذہن کا یہی اصل سبب ہے۔

پیغمبر امن

The Prophet of Peace

پیغمبر اسلام، محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب (وفات 632ء) کے متعلق ہسٹورین نے عام طور پر اعتراف کیا ہے کہ اُنہوں نے اپنی زندگی میں اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کی۔ مثال کے طور پر برٹش مؤرخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon, 1737-1794) نے اپنی کتاب ''روما کا عروج وزوال'' (The History of the Decline and Fall of the Roman Empire) میں پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے لائے ہوئے انقلاب کو تاریخ کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ بتایا ہے:

> The rise and expansion of Islam was one of the most memorable revolutions which has impressed a new and lasting character on the nations of the globe.

ایم۔ این۔ رائے (M.N. Roy) ایک انڈین لیڈر تھے۔ وہ بنگال میں 1887 میں پیدا ہوئے اور 1954 میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی کتاب ''ہسٹاریکل رول آف اسلام'' (Historical Role of Islam) پہلی بار دہلی سے 1939 میں چھپی۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں: محمد کو تمام پیغمبروں میں سب سے بڑا پیغمبر ماننا چاہیے۔ اسلام کی توسیع تمام معجزوں سے زیادہ بڑا معجزہ ہے:

> Mohammad must be recognised as by far the greatest of all prophets. The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles. (p. 4)

امریکا کے ڈاکٹر مائیکل ہارٹ (Michael H. Hart) کی کتاب ''دی ہنڈریڈ'' (The 100) نیویارک سے 1978 میں چھپی۔ اس کتاب میں انہوں نے پوری انسانی تاریخ سے ایک سو ایسے افراد کی فہرست بنائی ہے جنہوں نے اُن کے مطابق، اعلیٰ کامیابیاں حاصل کیں۔ اِس فہرست میں انہوں نے ٹاپ پر پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ کا نام رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''وہ تاریخ کے تنہا شخص

ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی‘‘:

He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels.

یہاں یہ سوال ہے کہ پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ کی اس عظیم کامیابی کا راز کیا تھا۔ اس کا راز ایک لفظ میں امن تھا۔ یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ پیغمبر اسلام تاریخ کے سب سے بڑے پیسیفسٹ (pacifist) تھے۔ اُنھوں نے پُرامن طریقہ (peaceful method) کو ایک کامیاب ترین ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ اس سلسلے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: الصُّلۡحُ خَيۡرٌ (4:128)۔ یعنی اختلافی معاملات میں پُرامن طریقہ زیادہ نتیجہ خیز طریقہ ہے:

Peaceful method is a far more effective method.

اسی طرح خود پیغمبر اسلام نے فرمایا: يُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2593)۔ یعنی خدا نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا:

God grants to peace what He does not grant to violence.

پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے امن کو ایک مکمل آئیڈیالوجی کے طور پر دریافت کیا۔ آپ نے امن کو ایک ایسے طریقۂ کار کے طور پر دریافت کیا جو ہر صورتِ حال کے لیے سب سے مؤثّر (effective) تدبیر کی حیثیت رکھتا تھا۔

ایک مفکّر نے لکھا ہے کہ ’’تاریخ کے تمام انقلابات صرف حکمرانوں کی تبدیلی (coup) کے واقعات تھے، وہ حقیقی معنوں میں انقلاب نہ تھے‘‘۔ یہ بات اگر صحیح ہو تو پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ کا نام اس معاملے میں ایک استثنا مانا جائے گا۔ کیوں کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعے وہ تمام انفرادی (individual)، سماجی اور سیاسی تبدیلیاں وقوع میں آئیں، جن کے مجموعے کو انقلاب (revolution) کہا جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی بنیاد پر میرا احساس یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا انسانی تاریخ میں جو کنٹری بیوشن

(contribution) ہے۔ اُس کے لحاظ سے اُن کا سب سے زیادہ مناسب نام یہی ہوسکتا ہے کہ اُن کو امن کا پیغمبر (Prophet of Peace) کہا جائے۔

تاریخ ایک ایسا ڈسپلن ہے جس میں یہ امکان رہتا ہے کہ مطالعہ کرنے والا ایک سے زیادہ رایوں تک پہنچ جائے۔ تاہم مصنف کا یہ خیال ہے کہ ایسا زیادہ تر محدود مطالعے کی بنا پر ہوتا ہے۔ اگر مطالعہ زیادہ وسیع اور جامع ہوتو تعدّدِ آراء کا امکان بہت کم ہوجاتا ہے۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں کچھ دفاعی لڑائیاں پیش آئیں۔ ان میں سے ایک دفاعی لڑائی وہ تھی جس کو جنگِ بدر کہا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جس وقت جنگ کا واقعہ ہوا، پیغمبر اسلام میدانِ جنگ سے باہر ایک عَریش میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ یا لکڑی سے آپ ریت پر کچھ لکیریں کھینچتے نظر آئے۔ اس واقعے کو لے کر ایک مستشرق نے بطور خود اس کو جنگ سے منسوب کیا، اور لکھا کہ ''قائدِ اسلام اُس وقت اپنی اگلی جنگ کا منصوبہ بنارہے تھے'':

The leader of Islam was making his next war plan.

مستشرق (Orientalist) نے یہ بات کسی حوالے کے بغیر صرف اپنے قیاس کی بنیاد پر لکھ دی۔ حالاں کہ دوسری روایات کو دیکھا جائے تو خود روایت کی بنیاد پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اُس وقت کیا کررہے تھے۔ وہ دراصل یہ نقشہ بنارہے تھے کہ آئندہ کس طرح امن قائم کیا جائے:

چنانچہ دوسری روایت میں بتایا گیا ہے کہ جس وقت بدر کی یہ دفاعی جنگ ہورہی تھی، عَین اُسی وقت خدا کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور کہا کہ خدا نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔ یہ سُن کر پیغمبر اسلام نے فرمایا: هُوَ السَّلَامُ وَمِنْهُ السَّلَامُ وَإِلَيْهِ السَّلَامُ (البدایۃ والنہایۃ، جلد 3، صفحہ 267)۔ یعنی خدا سلامتی ہے اور اُسی سے سلامتی ہے، اور اسی کی طرف سلامتی ہے۔

اس دوسری روایت کے مطابق درست طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر پیغمبر اسلام اپنا اگلا منصوبۂ امن بنارہے تھے:

The leader of Islam was making his next peace plan.

پیغمبر اسلام کو قرآن (21:107) میں پیغمبرِ رحمت کہا گیا ہے (وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ) یعنی پرافٹ آف مرسی۔ پرافٹ آف مرسی ہی کا دوسرا نام پرافٹ آف پیس ہے۔ دونوں ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے دو مختلف انداز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پیغمبر اسلام کا مشن کوئی پولیٹیکل مشن نہیں تھا۔ آپ کے مشن کو دوسرے الفاظ میں اسپریچول مشن کہا جاسکتا ہے۔ قرآن (2:129) میں اس کو تزکیۂ نفس (purification of the soul) بتایا گیا ہے۔ یعنی انسان کو کامل انسان بنانا۔ دوسری جگہ قرآن (89:27) میں اس کے لیے النّفس المطمئنّۃ (complex-free soul) کے الفاظ آئے ہیں۔

اس قسم کا مقصد صرف نصیحت اور تذکیر (persuasion) کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ مقصد ذہن کی تشکیلِ نَو (re-engineering of the mind) کا طالب ہے۔ یہ مقصد صرف انسان کی تھنکنگ قوت کو بیدار کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے حصول کا ذریعہ سیاسی انقلاب نہیں ہے، بلکہ ذہنی انقلاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیمات تمام تر امن کے تصور پر مبنی ہیں۔

پیغمبر اسلام کی لائی ہوئی کتاب قرآن میں تقریباً 6236 آیتیں ہیں۔ اِن آیتوں میں بمشکل چالیس آیتیں ایسی ہیں جن میں قتال یا جنگ کا ذکر ہے۔ یعنی کُل آیتوں کا ایک فیصد سے بھی کم حصہ۔ قرآن کی 99 فیصد سے زیادہ آیتیں وہ ہیں جن میں انسان کی قوتِ فکر کو بیدار کیا گیا ہے۔ اس لیے قرآن میں بار بار تدبر وتفکر پر ابھارا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن گویا آرٹ آف تھنکنگ کے موضوع پر ایک کتاب ہے، وہ کسی بھی درجے میں آرٹ آف فائٹنگ کی کتاب نہیں۔

پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور آپ کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نہ صرف نظریۂ امن پیش کیا بلکہ آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ پُرامن زندگی کے لیے ایک مکمل طریقِ کار وضع کیا:

He was able to develop a complete methodology of peaceful activism.

اسلام کے بعد کی سیاسی تاریخ نے پیغمبر اسلام کے اس پہلو پر ایک پردہ ڈال دیا تھا۔ اب ضرورت ہے کہ اس پردے کو ہٹایا جائے۔ یہ ہٹانا گویا پیغمبر اسلام کی دریافتِ نو (re-discovery of the Prophet of Islam) ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے نہ صرف امن کی ایک آئیڈیالوجی پیش کی، بلکہ امن کو عمل میں لانے کے لیے وہ ایک مکمل میتھاڈولوجی آف پیس ڈیولپ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ گویا کہ آپ نظریۂ امن کے آئیڈیالاگ بھی تھے، اور نظریۂ امن کو عملی انقلاب کی صورت دینے والے بھی۔

ابتدائی حالات

عرب ایک جزیرۂ نما ہے۔ وہ ایشیا کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے۔ یہ ایک صحرائی ملک ہے، اور انتہائی قدیم زمانے سے آباد ہے۔ قدیم زمانے سے یہاں مختلف قبائل اپنے اپنے علاقوں میں رہتے تھے۔ ہر قبیلے کا سردار اُن کے اوپر حاکم ہوا کرتا تھا۔

چار ہزار سال پہلے پیغمبر ابراہیم نے اپنے خاندان کو مکّہ کے علاقے میں آباد کیا۔ یہ لوگ ایک خدا کو مانتے تھے اور ایک خدا کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ باہر کے اثرات سے یہ لوگ بتوں کو پوجنے والے بن گئے۔ اب بھی وہ سماجی روایت کے طور پر ایک خدا کو مانتے تھے مگر اسی کے ساتھ عملی طور پر وہ بہت سے بتوں کو پوجتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں پورا عرب ایک بت پرست ملک بن چکا تھا۔ عرب کے یہی حالات تھے جب کہ پیغمبر اسلام وہاں پیدا ہوئے۔

پیغمبر اسلام محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب عرب کے شہر مکّہ میں 570 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 610 عیسوی میں مکّے میں اپنی پیغمبری کا اعلان کیا۔ 622 عیسوی میں وہ عرب کے دوسرے شہر مدینہ چلے گئے۔ 632 عیسوی میں مدینہ میں ان کی وفات ہوئی۔ اس طرح آپ کی کُل عمر 63 سال تھی، اور آپ کی پیغمبرانہ عمر 23 سال۔

آپ پیدا ہوئے تو آپ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ کی عمر چھ سال تھی تو آپ کی والدہ آمنہ بنت وہب بھی انتقال کر گئیں۔ اس کے بعد آپ اپنے دادا عبدالمطلب

اور اپنے چچا ابو طالب کی سر پرستی میں رہے۔ قرآن میں خدا نے پیغمبر اسلام کی ابتدائی زندگی کے بارے میں فرمایا: أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَى ۔ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى (93:6-7)۔یعنی کیا اللہ نے تم کو یتیم نہیں پایا، پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا۔ اور تم کو متلاشی پایا تو اس نے تم کو راہ دکھائی۔

قرآن کی اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام کو اپنی ابتدائی زندگی میں جب یتیمی کا تجربہ ہوا تو اس تجربے نے آپ کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ کوئی چیز آپ سے کھوئی گئی ہے۔ یہ احساس آخر کار حق کی تلاش کی صورت میں اُبھرا۔ آپ حق کی تلاش میں اتنا زیادہ سرگرداں ہوئے کہ اکثر آپ مکے کے باہر چلے جاتے اور قریبی پہاڑ حِرا کے ایک کھوہ میں تنہائی کی حالت میں زندگی کی حقیقت کے بارے میں سوچتے رہتے اور دعا کرتے رہتے۔ اس طرح آپ حق کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ خدا نے 610 عیسوی کی ایک رات کو آپ کے پاس فرشتہ بھیجا۔ فرشتے نے آپ کو بتایا کہ خدا نے آپ کو اپنے پیغمبر کی حیثیت سے چن لیا ہے۔ اس کے بعد آپ پر قرآن وقفے وقفے سے اُترتا رہا۔ 23 سال کی مدت میں وہ مکمّل ہوا۔

پیغمبر اسلام کو خدا کی طرف سے یہ مشن دیا گیا کہ وہ لوگوں کو توحید کا پیغام پہنچائیں۔ یعنی یہ کہ خدا صرف ایک ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ ہر اعتبار سے خدا رُخی زندگی (God-oriented life) گذارے۔ یہی انسان کی نجات کا راستہ ہے۔ پیغمبر اسلام اپنی ابتدائی زندگی میں ایک تاجر تھے۔ تاجر کی حیثیت سے ان کی تصویر ایسی بنی کہ لوگ اُن کو الامین (honest person) کہنے لگے۔ اس طرح آپ مکّے میں ایک باعزت شخص بن گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ پیغمبری ملنے کے بعد جب آپ نے مکّہ کے ایک ٹیلے ''صَفا'' پر چڑھ کر لوگوں کو پکارا تو لوگ آپ کی بات سننے کے لیے وہاں جمع ہو گئے۔

یہ نبوت کی حیثیت سے آپ کا پہلا خطاب تھا۔ اس خطاب میں آپ نے لوگوں کو بتایا کہ موت کے بعد ہر ایک کو یا تو جنت ملے گی یا جہنم۔ اس لیے تم لوگ موت سے پہلے کے زمانے میں موت کے بعد کے زمانے کی تیاری کرو۔

مکّہ میں اُس وقت بت پرستی کا رواج تھا۔لوگ بت پرستی میں کنڈیشنڈ ہو چکے تھے۔اس لیے ابتدائی زمانے کی اس تقریر کا لوگوں کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا۔لوگ اثر لیے بغیر واپس چلے گئے۔آپ کے چچا عبدالعزّ ی (ابولہب) نے منفی ردِّعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

”تمہارا بُرا ہو، کیا تم نے یہی کہنے کے لیے ہم کو بلایا تھا(تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ أَمَا جَمَعْتَنَا إِلَّا لِهَذَا)۔مستخرج ابی عوانہ، حدیث نمبر262

مکّہ عرب کا مرکزی شہر تھا۔یہاں قبیلۂ قریش کے لوگ رہتے تھے۔قریش کو کعبہ کی تولیت حاصل تھی، جو کہ پورے عرب کا مذہبی مرکز تھا۔اس بنا پر قریش کو پورے ملک میں سرداری کا مقام حاصل ہو گیا تھا۔قریش نے مکّہ میں دار الندوہ قائم کررکھا تھا۔دار الندوہ گویا قبائلی پارلیمنٹ تھی۔قریش کے سینئر افراد دار الندوہ کے ممبر ہوتے تھے۔یہاں تمام اہم اُمور کے فیصلے کیے جاتے تھے۔پیغمبر اسلام کے دادا عبد المطلب دار الندوہ کے ممتاز ممبروں میں سے ایک تھے۔

عام رواج کے مطابق، ایک حوصلہ مند لیڈر کے لیے پہلا ٹارگیٹ یہ تھا کہ وہ دار الندوہ کا رُکن بننے کی کوشش کرے۔جو گویا اُس وقت کے عرب میں سیاسی طاقت کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔بظاہر اس کے بغیر عرب یا مکّہ میں کوئی بڑا کام نہیں ہوسکتا تھا۔لیکن پیغمبر اسلام نے دار الندوہ میں داخلے کی کوئی کوشش نہیں کی۔حتی کہ اُنھوں نے یہ مطالبہ بھی نہیں کیا کہ اپنے دادا عبد المطلب کی خالی سیٹ اُنھیں دی جائے۔

دار الندوہ کے معاملے میں پیغمبر اسلام نے وہ پُرامن طریقہ اختیار کیا جس کو اسٹیٹس کوازم (status quoism) کہا جاتا ہے۔یعنی صورتِ موجودہ سے ٹکراؤ نہ کرنا، بلکہ جو صورتِ موجودہ ہے اس کو علی حالہٖ قبول کرلینا۔مگر پیغمبر اسلام کا اسٹیٹس کوازم سادہ طور پر صرف اسٹیٹس کوازم نہ تھا، بلکہ وہ مثبت اسٹیٹس کوازم (positive-status quoism) تھا۔مثبت اسٹیٹس کوازم یہ ہے کہ آدمی وقت کے نظام سے ٹکراؤ نہ کرے، بلکہ وہ یہ کرے کہ وقت کے نظام میں موجودہ مواقع کو دریافت کرکے اُسے استعمال کرے۔اس طریقِ کار کو فارمولا کی زبان میں اس طرح کہا جاسکتا ہے:

Ignore the problem, avail the opportunities.

پازیٹیو اسٹیٹس کوازم کا یہ طریقہ ایک انتہائی حکیمانہ طریقہ تھا۔ اس کی طرف رہنمائی پیغمبر اسلام کو خود قرآن کی ابتدائی آیتوں میں ان الفاظ میں دی گئی: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:5-6)۔ یعنی ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے، ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ اس طرح پیغمبر اسلام کو بتایا گیا کہ اس دنیا میں کوئی مسئلہ کبھی کُلّی معنوں میں مسئلہ نہیں ہوتا، بلکہ ہر مسئلہ کے ساتھ ہمیشہ مواقع موجود رہتے ہیں۔ اس لیے آدمی کو یہ حکمت اختیار کرنا چاہیے کہ وہ مسائل کو نظر انداز کرے اور مواقع کو استعمال کرے۔ پیغمبر اسلام کے لیے یہ طریقہ ایک حکیمانہ آغاز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آج جو ممکن ہے، اُس سے اپنے عمل کا آغاز کرو۔ اس طرح کل وہ چیز ممکن ہو جائے گی جو بظاہر آج ممکن نظر نہیں آتی۔

پیغمبر اسلام کا مشن توحید (oneness of God) کا قیام تھا۔ اس لحاظ سے آپ کے لیے اُس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مکّہ کے مقدس عبادتی مرکز کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے۔ یہ عرب کے مختلف قبائل کے بُت تھے۔ اور مکّہ کے سرداروں نے ان بتوں کو کعبے میں اس لیے رکھا تھا تاکہ وہ مکہ کو مرکزی مقام کا درجہ دے سکیں۔ کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت کا ہونا ایک پرابلم تھا، مگر اسی کے ساتھ اُس میں ایک موقع (opportunity) بھی چھپی ہوئی تھی۔ ان بتوں کی وجہ سے ایسا ہوتا تھا کہ مکّہ کے لوگ اور مکّہ کے باہر کے لوگ وہاں ہر روز جمع ہوتے تھے۔ اس طرح کعبہ لوگوں کے لیے اجتماع کا ایک فطری مقام بن گیا تھا۔ پیغمبر اسلام نے کعبہ میں بتوں کی موجودگی کو نظر انداز کیا، اور ان بتوں کی وجہ سے وہاں لوگوں کے اجتماع کو ایک موقع کے طور پر استعمال کیا۔ اب آپ نے یہ کیا کہ آپ روزانہ وہاں جاتے اور لوگوں سے ملاقات کرتے اور ان کو قرآن کی آیتیں سناتے۔

قدیم مکّہ میں پیغمبر اسلام نے دعوت کا جو مذکورہ طریقہ اختیار کیا، وہ پرابلم سے خالی نہ تھا۔ مثال کے طور پر قرآن کی سورہ النجم اُتری تو حسب معمول آپ نے یہ کیا کہ کعبہ کے اجتماع میں جا کر لوگوں کو

اُسے پڑھ کر سنایا۔ اس سورہ میں عرب کے بڑے بڑے بتوں کو بے حقیقت بتاتے ہوئے یہ الفاظ تھے:

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى ۔ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى (53:19-20) ۔یعنی بھلا تم نے لات اور عزیٰ پر غور کیا ہے۔ اور تیسرے ایک اور منات پر۔

اس آیت میں لات، عزّیٰ اور مَنات کے نام آئے ہیں۔ یہ تینوں بُت قدیم عرب کے بڑے بڑے بُت تھے۔ قدیم عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی مجلس میں اِن بتوں کا نام آتا تو وہ اُن کے اعتراف کے لیے کچھ تعظیمی الفاظ بولتے۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ جب پیغمبر اسلام نے قرآن پڑھتے ہوئے لات وعزّیٰ اور منات کے نام لیے تو وہاں کے مشرک حاضرین نے اپنے رواج کے مطابق، بلند آواز سے کہا:

تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَى. وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى

پیغمبر اسلام کی آواز میں حاضرین کی مذکورہ آواز مل گئی۔ انہوں نے سمجھا کہ خود رسول اللہ نے یہ الفاظ کہے ہیں۔ یہ خبر نہایت تیزی سے پھیل گئی، یہاں تک کہ یہ خبر حبش تک پھیل گئی۔ بہت سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ پیغمبر اسلام نے مشرک عربوں کے اس مطالبے کو مان لیا ہے کہ اُن کے جو بُت ہیں وہ بھی خدا کی خدائی میں شریک ہیں۔ حالاں کہ یہ صرف ایک غلط فہمی تھی، نہ کہ کوئی حقیقی واقعہ۔

اس طرح مکّہ میں پیغمبر اسلام لوگوں کو مسلسل عقیدۂ توحید کی طرف بلاتے رہے۔ اِس مقصد کے لیے وہ لوگوں کو خطاب بھی کرتے اور انفرادی طور پر ان سے مل کر اُنہیں اپنا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس طرح ایک ایک کرکے لوگ پیغمبر اسلام کے دین میں داخل ہوتے رہے۔ مثلاً حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، وغیرہ۔ تجربہ بتاتا ہے کہ لوگ اپنے مذہبی عقیدے کے بارے میں بہت زیادہ حسّاس ہوتے ہیں۔ چنانچہ مکّہ میں پیغمبر اسلام کی مخالفت شروع ہوگئی۔ قریش ہر تدبیر سے یہ کوشش کرنے لگے کہ آپ کا توحید کا مشن ختم ہوجائے۔ اس مخالفت کا سبب کسی بھی درجے میں سیاسی نہ تھا، وہ صرف اعتقادی حسّاسیت کی بنا پر تھا۔ اس مخالفت کا سبب صرف اعتقادی اختلاف تھا، نہ کہ کوئی سیاسی خطرہ۔

پیغمبر اسلام کے اس ابتدائی دَور میں آپ کی بیوی خدیجہ اور آپ کے چچا ابوطالب آپ کے

لیے گویا سپورٹ سسٹم بنے ہوئے تھے۔ اعلانِ نبوت کے دسویں سال اِن دونوں کا انتقال ہوگیا۔ قدیم قبائلی رواج کے مطابق، اب آپ کو ضرورت تھی کہ آپ کسی اور کو تلاش کریں، جو آپ کو اپنی پناہ میں لے لے۔ تاکہ آپ اپنا مشن بدستور جاری رکھ سکیں۔

پناہ کے حصول کے لیے پہلے آپ نے مکّہ میں کوشش کی۔ کعبہ کی زیارت کے لیے جو قبائلی سردار مکّہ آتے تھے، اُن سے اس مقصد کے لیے ملاقاتیں کیں۔ مگر اُن میں سے کوئی شخص تیّار نہیں ہوا۔ آخر کار آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ مکّہ سے 75 کلومیٹر دور واقع شہر طائف جائیں۔ اور وہاں کے سرداروں سے پناہ طلب کریں۔ عرب رواج کے مطابق یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر طائف کے سردار جو خود بھی بتوں کے پرستار تھے، وہ توحید کے پیغمبر کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بلکہ انہوں نے اپنے شہر کے لڑکوں کو اُکسایا کہ وہ آپ کو پتھر مار کر شہر کے باہر کردیں۔

آپ طائف سے باہر ایک باغ میں رات گذارنے کے لیے پناہ لیے ہوئے تھے۔ روایت کے مطابق، اُس وقت، خدا نے پہاڑوں کا فرشتہ (مَلک الجبال) کو آپ کے پاس بھیجا۔ ملک الجبال نے آپ سے کہا کہ طائف والوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کو خدا نے دیکھا۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں طائف کے اَطراف میں واقع پہاڑوں کو ایک دوسرے میں ملادوں۔ تاکہ طائف کے لوگ اُس میں دب کر ختم ہوجائیں۔ مگر پیغمبر اسلام نے کہا کہ نہیں۔ طائف کی موجودہ نسل نے اگرچہ میری بات کو ماننے سے انکار کردیا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ طائف کی اگلی نسلیں میری بات کو مانیں گی اور خدا کے راستے پر چلیں گی (بَلْ أَرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ مِنْ أَصْلاَبِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ وَحْدَهُ، لاَ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا) صحیح البخاری، حدیث نمبر 3231۔

پیغمبر اسلام طائف سے واپس ہوکر دوبارہ مکّہ پہنچے تو قریش کا ظلم اور زیادہ بڑھ گیا۔ انہوں نے دارالندوہ میں مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو قتل کردیں۔ اس فیصلے میں مکہ کے تمام قبائل شریک ہوگئے۔ اُس وقت مکّہ اور اطرافِ مکہ میں تقریباً دوسو آدمی پیغمبر اسلام کے پیغام کو مان کر اُن کے ساتھی بن چکے تھے، مگر یہ تعداد قریش کے مقابلے میں آپ کی حمایت کے لیے ناکافی تھی۔ چنانچہ

آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ مکہ چھوڑ کر عرب کے دوسرے شہر مدینہ چلے جائیں، جو مکہ سے تقریباً تین سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

مدینہ میں اسلام کا داخلہ

پیغمبر اسلام ابھی مکّہ میں تھے کہ آپ نے اپنے دو ساتھیوں کو مکّہ سے مدینہ کے لیے روانہ کیا۔ یہ لوگ وہاں اس لیے گئے تھے تاکہ آپ کا پیغام مدینہ والوں کو پہنچائیں۔ مدینہ والوں کی زبان عربی تھی، جس طرح مکہ والوں کی زبان عربی۔ چنانچہ اِن لوگوں نے یہ کیا کہ قرآن کے مختلف حصوں کو پڑھ کر اُنھیں سنانے لگے۔ اسی لیے ان کا نام مُقری پڑ گیا (وَكَانَ يُدْعَى الْمُقْرِئَ) معرفۃ الصحابہ لابی نعیم الاصفہانی، جلد 5، صفحہ 2556۔ عربی زبان میں مقری کے معنی ہیں: پڑھ کر سنانے والا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ مکہ کے برعکس مدینہ میں پیغمبر اسلام کا پیغام تیزی سے پھیلنے لگا۔ مدینہ کے تقریباً ہر گھر میں ایسے افراد پیدا ہو گئے جنھوں نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی اور پیغمبر اسلام کے دین کو اختیار کر لیا۔ مکّہ میں مخالفت اور مدینہ میں موافقت کا یہ دو مختلف تجربہ کیوں ہوا۔ اس کا ایک معلوم سبب تھا۔ وہ یہ کہ مکّہ عرب کے صحرائی علاقے میں واقع تھا۔ یہاں زراعت وغیرہ موجود نہیں تھی۔ مکّہ والوں کی معیشت بڑی حد تک بت پرستی کے کلچر سے وابستہ تھی۔ کعبہ اُس زمانے میں پورے عرب میں بت پرستی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس بنا پر ایسا ہوا تھا کہ عرب کے تمام قبائل کے لوگ سال بھر یہاں آتے۔ اس طرح بت پرستی میں مکّہ والوں کے لیے ایک اقتصادی قدر (commercial value) پیدا ہو گئی تھی۔ گویا کہ قدیم مکّہ میں بتوں کو وہی حیثیت حاصل ہو گئی تھی جس کو موجودہ زمانے میں ٹورسٹ انڈسٹری کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر مکّہ کے لوگ ڈرتے تھے کہ اگر عرب سے بت پرستی کا خاتمہ ہو جائے تو ان کی ''ٹورسٹ انڈسٹری'' ختم ہو جائے گی۔

اہل مدینہ کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ مدینہ عرب کے ایک ایسے علاقے میں واقع تھا جہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔ اس بنا پر وہاں زراعت اور باغبانی کا کافی رواج تھا۔ یہاں کے لوگوں کے لیے یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی کا خاتمہ ہو جائے تو اُن کی معاش کا ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ کیوں کہ بت پرستی

ان کی معاش کا ذریعہ ہی نہ تھی۔

اس بنا پر ایسا ہوا کہ توحید کا مذہب اہلِ مکّہ کے لیے ابتدائی زمانے میں قابلِ قبول نہ ہوسکا۔ مگر اہلِ مدینہ اس قسم کی نفسیات سے خالی تھے۔ بت پرستی کا خاتمہ ان کے نزدیک صرف ایک مذہبی کلچر کا خاتمہ تھا، نہ کہ ان کے معاشی ذریعے کا خاتمہ۔ چنانچہ مدینے میں پیغمبر اسلام کا پیغام تیزی سے پھیل گیا۔

پیغمبر اسلام کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ دراصل ٹکراؤ کے طریقے کو چھوڑ کر امن کے طریقے کو اختیار کرنا تھا۔ پیغمبر اسلام کے اس اصول کو آپ کی اہلیہ حضرت عائشہ نے اِن الفاظ میں بیان کیا: مَا خُيِّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6786)۔ یعنی پیغمبر اسلام کو جب بھی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ یہ کرتے کہ مشکل کے مقابلے میں آسان طریقے کا انتخاب فرماتے۔

اس معاملے کی ایک واضح مثال مکّہ کے تیرہ سالہ قیام کے آخری دنوں میں آپ کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا۔ یا تو قریش سے جنگی ٹکراؤ کریں، یا خاموشی کے ساتھ پُرامن طور پر مکّہ سے نکل کر مدینہ چلے جائیں۔ اُس وقت کے حالات میں پہلا انتخاب مشکل انتخاب (harder option) تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسرا انتخاب، یعنی خاموشی سے مدینہ چلے جانا ایک آسان انتخاب (easier option) تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام نے اپنے اصول کے مطابق اُس کو لے لیا جو آسان تھا، اور اس کو چھوڑ دیا جو مشکل تھا۔

مکّہ سے مدینہ کا یہ سفر تقریباً پانچ سو کلومیٹر کا سفر تھا۔ یہ پورا سفر اونٹ پر گذرا۔ مگر چوں کہ آپ کو معلوم تھا کہ مکّہ کے لوگ آپ کو پکڑنے کے لیے آپ کا پیچھا کررہے ہیں، اس لیے آپ نے ان سے بچاؤ کے لیے مختلف طریقے اپنائے۔ مثلاً مکہ سے رات کے وقت خاموشی سے روانگی۔ سیدھے مدینہ سفر کرنے کے بجائے مخالف سمت کے ایک غیر آباد کھوہ میں تین دن چھپے رہنا۔ عام راستے کے بجائے نئے راستے سے سفر کرنا، وغیرہ۔

ہجرت کے اس سفر میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جو بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا مزاج کیا تھا۔ مثلاً ایک مقام پر آپ کو دو شخص ملے۔ وہ دونوں آپس میں بھائی تھے۔ آپ نے اُن سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے قبیلے نے ہم دونوں کا ایک ہی نام رکھا ہے۔ وہ ہے الْمُهَانَانِ (دو بے عزّت آدمی)، آپ نے فرمایا کہ نہیں، تم دونوں باعزت آدمی ہو (بَلْ أَنْتُمَا الْمُكْرَمَانِ) مسند احمد، حدیث نمبر 16691۔

یہ طریقہ آپ کے اصولِ تربیت کا ایک حصہ تھا۔ آپ جانتے تھے کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر مثبت انداز میں کی جائے۔ اس لیے آپ نے اُن کا نام بدل دیا۔ اس طرح انھیں یہ نفسیاتی ترغیب دی کہ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ انسانیت کے رُخ پر ترقی دیں۔ اسی طرح بعد کے زمانے میں آپ کی صاحب زادی حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علی بن ابی طالب سے ہُوا۔ ان کے یہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا تو پیغمبر اسلام نے علی سے پوچھا کہ تم نے بیٹے کا نام کیا رکھا۔ اُنھوں نے کہا کہ حَرب (جنگ) پیغمبر اسلام نے کہا کہ یہ نام درست نہیں۔ اس کے بعد آپ نے اس کا نام حَسن رکھا (فَسَمَّاهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 2777۔

مدنی زندگی

622 عیسوی سے پیغمبر اسلام کی مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کا ہجرت کر کے مدینہ پہنچنا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اس سے پہلے مکّہ کی تیرہ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں آپ کو نہایت تلخ تجربے پیش آئے تھے۔ آپ کو مسلسل ستایا گیا، آپ کے ساتھیوں کو مارا پیٹا گیا، آپ کا اور آپ کے خاندان کا بائیکاٹ کیا گیا، آپ کو اتنی شدید مصیبتوں میں مبتلا کیا گیا کہ آپ اور آپ کے ایک سو سے زیادہ ساتھی اپنے وطن اور اپنی جائداد کو چھوڑ کر مکّہ سے مدینہ آ گئے۔ یہاں انھیں اپنے گھر اور اپنے عزیزوں سے محروم ہو کر ازسرِنو اپنی زندگی کی تعمیر کا مشکل کام کرنا تھا۔

ایسی حالت میں یہ ہونا چاہیے تھا کہ پیغمبر اسلام کا دل شکایت اور احتجاج سے بھرا ہوا ہو اور وہ مدینہ پہنچتے ہی مکّہ والوں کے خلاف منفی باتیں کہنا شروع کر دیں۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ پیغمبر

اسلام نے مدینہ پہنچ کر مدینہ والوں کے سامنے جو پہلی تقریر کی، وہ اب بھی سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ سیرت ابن ہشام میں اس کو" مدینہ کا پہلا خطبہ" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے —— وَكَانَتْ أَوَّلُ خُطْبَةٍ خَطَبَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ آپ کے اس خطبے کا خلاصہ یہ ہے —— فَمَنْ اسْتَطَاعَ أَنْ يَقِيَ وَجْهَهُ مِنْ النَّارِ وَلَوْ بِشِقٍّ مِنْ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 501)۔ یعنی تم میں سے جو اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی طاقت رکھتا ہو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعے کیوں نہ ہو، وہ ضرور کرے۔

یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ دراصل پیس فل ایکٹوزم کی قیمت تھی۔ اُس وقت کے حالات میں بلا شبہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ یہ اپنے منفی جذبات کو مثبت جذبات میں کنورٹ کرنا تھا۔ مگر یہی پیس فل ایکٹوزم کی قیمت ہے۔ اس قیمت کو ادا کیے بغیر کوئی شخص پیس فل ایکٹوزم کے اصول پر قائم نہیں رہ سکتا۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ امن اور تشدد دونوں ہی داخلی احساسات کا اظہار ہوتے ہیں۔ اگر آدمی کے ذہن میں نفرت ہو تو اس کا اظہار متشددانہ (violent) عمل کی صورت میں ہوگا، اور اگر اس کے ذہن میں محبت ہو تو اس کا اظہار ہمیشہ پُر امن طریقِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ایسی حالت میں پیس فل ایکٹوزم کا نام لینا، کوئی سادہ بات نہیں، وہ ایک قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ قربانی یہ کہ آدمی نفرت کے اسباب کے باوجود فریقِ ثانی سے نفرت نہ کرے، وہ اپنے دماغ کو نفرت والی باتوں سے پوری طرح خالی رکھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی پُر امن طریقِ کار پر عمل کرنا چاہتا ہو اُس کو سب سے پہلے خود اپنے ذہن کو میانہ روی پر قائم رکھنا ہوگا۔ اُس کو یک طرفہ طور پر یہ کرنا ہوگا کہ فریقِ ثانی اس کو غصہ دلائے، مگر وہ ہرگز غصہ نہ ہو۔ اس قیمت کو ادا کیے بغیر کوئی شخص پُر امن طریقِ کار کے اصول کو اختیار نہیں کرسکتا۔

پیغمبر اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار پُر امن ایکٹوزم کا مکمل نمونہ پیش کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ آپ نے یک طرفہ اعتدال پسندی کی مذکورہ قیمت ادا کی۔ آپ کے ساتھ فریقِ ثانی کی طرف

سے ہر قسم کی زیادتی کی گئی مگر آپ ان زیادتیوں سے اوپر اُٹھ کر سوچتے رہے۔ ان کی زیادتیوں کو نظر انداز کرکے آپ نے مثبت انداز میں اپنے عمل کا نقشہ بنایا۔

پیغمبر اسلام کی یہ تقریر بتاتی ہے کہ آپ مکمل معنوں میں ایک امن پسند انسان تھے۔ کوئی بڑے سے بڑا ناخوش گوار واقعہ آپ کے ذہنی سکون (peace of mind) کو درہم برہم نہیں کرسکتا تھا۔ آپ نے اپنے ذہن کی سطح پر ایک ایسی بلند چیز پالی تھی کہ اس کے بعد ہر دوسری چیز آپ کو غیر اہم معلوم ہوتی تھی۔ آپ کامل معنوں میں ایک مثبت ذہن کے انسان تھے۔ آپ کا دماغ گویا ایک ایسا کارخانہ تھا جس میں داخل ہو کر ایک نیگیٹیو آئٹم بھی پازیٹیو آئٹم بن جاتا تھا۔ آپ کو اپنی زندگی میں جب بھی کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آتا تو آپ کا ذہن فوری طور پر ڈفیوز کرکے اس کو ایک مثبت احساس میں تبدیل کرلیتا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے حافظے تک جب کوئی منفی احساس پہنچتا تو وہ بدل کر مثبت احساس بن چکا ہوتا تھا۔ آپ کی شخصیت کامل معنوں میں ایک مثبت شخصیت تھی۔ آپ منفی حالات میں بھی مثبت ذہن کے ساتھ رہنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ تشدد کے واقعات کو بدل کر امن کا واقعہ بنانے کی غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔

622 عیسوی میں جب آپ مدینہ پہنچے اس وقت مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی موجود تھے۔ گویا کہ اس وقت کا مدینہ ایک ملٹی ریلیجس سوسائٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایسے ماحول میں لوگ کس طرح پُرامن طور پر رہیں، آپ نے اس کا ایک کامیاب فارمولا دریافت کیا۔ یہ فارمولا اس اصول پر مبنی تھا — ایک کی پیروی کرو، اور سب کا احترام کرو:

Follow one and respect all.

اس وقت کے مدینہ میں تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہوچکی تھی۔ اس لیے اُس وقت کے مدینہ میں جو ابتدائی ریاست بنی، اُس کے صدر خود پیغمبر اسلام تھے۔ آپ نے صدرِ ریاست کی حیثیت سے ایک ڈیکلیریشن (declaration) جاری کیا، جو تاریخ میں صحیفۂ مدینہ یا میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس ڈیکلیریشن میں بتایا گیا تھا کہ مسلم، مشرک اور یہود، تینوں

کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات کو خود اپنے مذہب اور کلچر کے مطابق طے کریں۔ البتہ جہاں تک اجتماعی نزاعات کی بات ہے، اُن کو اللہ اور اس کے رسول کے طریقے کے مطابق طَے کیا جائے گا (وَإِنَّكُمْ مَهْمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ، فَإِنَّ مَرَدَّهُ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَإِلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 503۔

یہ کثیر مذہبی یا کثیر کلچر والے سماج میں امن قائم کرنے کا واحد عملی اصول ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں ہر ایک اپنے طریقے کی پیروی کرنے میں آزاد ہو۔ جہاں تک اجتماعی معاملات کا تعلق ہے، یعنی وہ معاملات جن میں رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہوجاتی ہیں، وہاں مرکزی انتظامیہ کی اتّباع کرنا۔ اس طریقے کو دوسرے الفاظ میں پُر امن ڈفرینس مینجمنٹ (peaceful difference management) کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر سماج میں ہمیشہ فرق اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ خواہ یہ سماج واحد مذہبی سماج ہو یا کثیر مذہبی سماج۔ اس فرق کو تسلیم کیا جاسکتا ہے، مگر اس کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ ایسے حالات میں کسی سماج میں امن قائم کرنا صرف بقائے باہم (co-existence) کے اصول پر مبنی ہے۔ اس معاملے میں دوسرا کوئی انتخاب ممکن نہیں۔

مدینہ پہنچ کر آپ نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے وہاں ایک مسجد بنائی۔ اور اس مسجد میں پانچ وقت کی نماز کا نظام قائم کیا۔ اس نماز کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت کا منظّم طریقہ تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ انسان کے اندر وہ صلاحیتیں پیدا ہوں جن کے ذریعے وہ سماج کے اندر پُر امن طور پر رہ سکے۔ چنانچہ آپ نے نماز کا جو طریقہ مقرر کیا اس کے خاتمے پر تمام نمازیوں کو اپنا چہرا دائیں اور بائیں پھیر کر یہ کہنا ہوتا تھا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس طرح گویا نمازی ساری دنیا کے انسانوں کو مخاطب کرکے یہ کہتا ہے کہ اے لوگو، تمہارے اوپر سلامتی (peace) ہو۔

اس طرح نمازِ باجماعت گویا لوگوں کی اس انداز میں تربیت کا ذریعہ تھی کہ وہ اپنے سماج میں پُرامن شہری بن کر رہیں۔ سماج کے لوگوں کے لیے ان کے دل میں ہر حال میں مثبت جذبات ہوں، وہ دوسروں کے لیے کبھی مسئلہ نہ بنیں۔ اُن کا رویّہ دوسروں کے ساتھ انسان دوستی (human

(friendly والا رویّہ ہو۔

پیغمبر اسلام جب ہجرت کر کے مکّہ سے مدینہ آ گئے تو یہ ٹکراؤ کا خاتمہ نہ تھا بلکہ یہ ٹکراؤ کے نئے دَور کا آغاز بن گیا۔ پیغمبر اسلام نے خود تو یہ قربانی دی کہ جنگ سے بچنے کے لیے اپنے وطن مکّہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ جا کر آباد ہو گئے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ مدینہ آپ کے مشن کے لیے ایک زرخیز علاقہ ثابت ہوا۔ یہاں کے لوگ تیزی سے آپ کے دین میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ اہلِ مدینہ کی اکثریت آپ کی ساتھی بن گئی۔

پیغمبر اسلام کی ہجرت کے بعد یہ ہوا کہ مکّہ اور مکہ کے آس پاس دوسرے مسلمان بھی اپنے مقامات کو چھوڑ کر مدینہ آ گئے۔ اس طرح مدینہ، پیغمبر اسلام کے مشن کا ایک مضبوط مرکز بن گیا۔ یہاں مدینہ کے اندر اور مدینہ کے باہر، دونوں علاقوں کے لوگ جمع ہو گئے۔ یہ مکّہ والوں کے لیے گویا ایک وارننگ تھی۔ وہ اپنے طور پر یہ سوچنے لگے کہ پیغمبر اسلام مدینہ میں اپنے افراد کو اکٹھا کر کے ایک بڑی قوت بنائیں گے اور مکّہ کو واپس لینے کے لیے مکّہ پر حملہ کر دیں گے۔ اس لیے مکّہ والوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ مدینہ میں پیغمبر اسلام کی طاقت کو توڑ کر اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

اس مقصد کے لیے مکّہ والوں نے عوامی عطیات سے پچاس ہزار دینار اکھٹا کیے، اور تیاری شروع کر دی۔ یہاں تک کہ انھوں نے مدینہ پر باقاعدہ حملے کا منصوبہ بنالیا۔ حتی کہ ایک ہزار کی تعداد میں مسلّح فوج لے کر روانہ ہوئے تاکہ مدینہ کی جدید مسلم ریاست کا خاتمہ کر دیں۔

اس طرح مدنی دَور میں غزوات (لڑائیوں) کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سیرت کی کتابوں میں تقریباً 85 غزوات شمار کیے گئے ہیں۔ مگر یہ غزوات فریقِ ثانی کی طرف سے غزوات تھے اور پیغمبر اسلام کی طرف سے اعراض۔ پیغمبر اسلام کی پالیسی یہ تھی کہ فریقِ ثانی کے جنگی اقدام کا مقابلہ پُر امن تدبیروں سے کریں۔ اس پُر امن تدبیر کے لیے امن پسند انسانوں کی ایک تربیت یافتہ ٹیم درکار تھی۔ اصحابِ رسول نے یہی کام کیا۔ چنانچہ تشدد کا مقابلہ امن کے ذریعہ کرنے کی تدبیر اس طرح کامیاب ہوئی کہ بیس سال کی مختصر مدت میں پورا عرب اسلام کے کنٹرول میں آ گیا۔

اس پُرامن تدبیری مہم کا ایک خاص جُزء یہ تھا کہ پیغمبر اسلام نے عرب کے تمام قبائل سے معاہدے کرلیے، اورتمام قبائل کو امن کا پابند بنا لیا۔ یہ ایک نیا طریقہ تھا جس کو معاہدہ ڈپلومیسی کہا جاسکتا ہے۔انہیں تدبیروں کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب جیسے جنگ جُو ملک میں مختصر مدت کے اندر ایک ایسا انقلاب آ گیا جس کو بلا شبہ ایک غیرخونی انقلاب(bloodless revolution) کہا جاسکتا ہے۔

صبر کا فلسفہ

پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں صبر (patience) کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔قرآن میں تقریباً ایک سو دس آیتیں ہیں جن میں صبر کے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ صبر ہی پر کامیابی کا مدار رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ اے لوگو! صبر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ(آلِ عمران، 3:200)۔اسی طرح فرمایا کہ امامت یا لیڈرشپ میں کامیابی کا راز صبر ہے(السجدہ،32:24)۔

اسی حقیقت کو پیغمبر اسلام نے اپنی ایک لمبی حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا:وَأَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ (مسند احمد، حدیث نمبر 2803)۔یعنی جان لو کہ کامیابی صبر کے ساتھ جُڑی ہوئی ہے۔ صبر نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔ کامیابی کا درخت ہمیشہ صبر کی زمین پر اُگتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے تمام پیسیفسٹ (pacifist) یا پیس فل ایکٹوسٹ (peaceful activist) اپنے نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کا مشترک سبب یہ ہے کہ انہوں نے امن کو دریافت کیا مگر وہ صبر کو دریافت نہ کرسکے۔ حالاں کہ صابرانہ روش کے بغیر پُرامن تحریک کو چلانا ممکن نہیں۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی کو اپنا دشمن قرار دیتے ہیں اوراس کے بعد پیس فُل ایکٹوزم کے اصول پر اس کے خلاف تحریک چلاتے ہیں۔ جیسا کہ نیلسن منڈیلا نے ساؤتھ افریقہ میں کیا۔ انہوں نے ساؤتھ افریقہ کے سفید فام مکینوں کے خلاف نفرت پھیلائی اور پھر کہا کہ ہم ان کو ساؤتھ افریقہ سے نکالنے کے لیے پیس فُل تحریک چلائیں گے۔ حالاں کہ دونوں ایک دوسرے کی نفی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیلسن منڈیلا کی تحریک کامیاب نہ ہوسکی۔ کسی گروہ کے مقابلے میں پیس فل ایکٹوزم کے اصول پر تحریک چلانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دل میں اس کے خلاف منفی جذبات نہ

ہوں۔اس کے مقابلے میں آپ مکمل طور پر مثبت نفسیات کے حامل ہوں۔ یہی واحد بنیاد ہے جس کے اوپر پیس فل ایکٹوزم کی سرگرمیاں جاری ہوسکتی ہیں۔ مدِّ مقابل گروہ کے لیے آپ کے دل میں اگر مثبت جذبات نہ ہوں تو آپ کبھی اپنے پُرامن مشن میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

عملاً یہ ہوتا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے مقابلے میں پُرامن طریقِ کار کی بنیاد پر ایک تحریک اُٹھاتا ہے، لیکن فریقِ ثانی کی مفروضہ یا غیر مفروضہ زیادتیوں کا احساس فریقِ اوّل کے خلاف اس کے دل میں نفرت ڈال دیتا ہے۔ یہ نفرت دھیرے دھیرے تشدّد کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور اگر تشدد کے ذریعہ مطلوب کامیابی نہ مل رہی ہو تو فریقِ اوّل کے دل میں فریقِ ثانی کے خلاف نفرت کا طوفان اس کو اس حد تک لے جاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف ہر ممکن تخریبی کارروائی شروع کردے۔ یہاں تک کہ اس کو مٹانے کے لیے اُس قسم کی بھیانک کارروائی کرنے لگے جس کو موجودہ زمانے میں خودکُش بمباری (suicide bombing) کہتے ہیں۔

پیس فل ایکٹوزم کے سلسلے میں یہ بات غالباً پوری تاریخ میں صرف پیغمبر اسلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ دوسرے مصلحین کی طرح ان کو بھی فریقِ ثانی کی طرف سے سخت قسم کی زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ نے کبھی اُن کے خلاف نفرت کی زبان استعمال نہیں کی۔ اپنے ساتھیوں کو بھی آپ ہمیشہ نفرت کے احساس سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ آپ کی زندگی میں اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

مثال کے طور پر مکہ میں پیغمبر اسلام کے ساتھیوں کا ایک خاندان تھا، جس کو آلِ یاسر کہا جاتا تھا۔ یہ ایک کمزور خاندان تھا۔ چنانچہ آپ کے طاقت ور مخالفین نے اُنہیں مارنا پیٹنا شروع کیا اور کہا کہ پیغمبر کا ساتھ چھوڑ دو۔ پیغمبر اسلام نے اس منظر کو دیکھا تو آپ نے زیادتی کرنے والوں کے خلاف نفرت کا کوئی کلمہ نہیں کہا، بلکہ یہ کہا: صَبْرًا يَا آلَ يَاسِرٍ، فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 5646)۔ یعنی اے آل یاسر صبر کرو، کیوں کہ تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ جنت کو صبر کا انعام بتا کر آپ نے اپنے ساتھیوں کو اس کے لیے آمادہ کیا کہ وہ کسی بھی

زیادتی پر مشتعل نہ ہوں۔ وہ کسی بھی حال میں فریقِ ثانی کے خلاف اپنے دل میں منفی جذبات کی پرورش نہ کریں۔

یہ پیغمبر اسلام کی پالیسی کا نہایت اہم پہلو تھا جو آپ نے خدا کی رہنمائی کے مطابق اختیار کی۔ یعنی مخالفوں کی ہر زیادتی پر صبر کرنا۔ قرآن میں اس سلسلے میں واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً نبیوں کی زبانی یہ کہا گیا ہے: وَلَنَصۡبِرَنَّ عَلَىٰ مَآ ءَاذَيۡتُمُونَا (14:12)۔ یعنی ہم تمہاری ایذاؤں پر صرف صبر ہی کریں گے۔

یہ صبر کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فریقِ ثانی کی ظالمانہ کارروائی کے باوجود مثبت سوچ پر قائم رہنا، اپنے آپ کو اس سے بچانا کہ اپنے ذہن میں فریقِ ثانی کی منفی تصویر بن جائے۔ کیوں کہ فریقِ اوّل کے دل میں اگر فریقِ ثانی کی منفی تصویر بن جائے تو فریقِ اوّل کبھی فریقِ ثانی کے ساتھ پُرامن طریقِ کار کے اصول پر قائم نہیں رہ سکتا۔ صبر کا اصول فریقِ اوّل کو اس سے بچاتا ہے کہ اس کا ذہن فریقِ ثانی کے بارے میں غیر معتدل ہوجائے۔ پر امن طریقِ کار (peaceful activism) دراصل معتدل ذہن کا اظہار ہے۔ غیر معتدل یا منفی ذہن کبھی پُرامن طریقِ کار کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا۔ صبر کا یہ اصول دراصل اسی اعتدال یا مثبت مزاج کی برقراری کی ایک یقینی گارنٹی ہے۔

پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کے ساتھ مخاطب گروہ کی طرف سے مسلسل زیادتیاں کی گئیں، لیکن آپ ہمیشہ پابندی کے ساتھ صبر کے اصول پر قائم رہے، اور اپنے ساتھیوں کو اسی کی تلقین کی۔ آپ کی مجلسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مخالفین کے ظلم کا چرچا کیا جائے۔ آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ مخالفین کے ظلم کے حوالے سے ان کے خلاف بد دعائیں کریں۔ اس کے برعکس، آپ ہمیشہ ظلم کرنے والوں کے خلاف اچھی دعا کرتے تھے۔ آپ نے مخالفوں کو کبھی کافر یا دشمن نہیں کہا، بلکہ ہمیشہ ان کے بارے میں انسان کا لفظ بولتے رہے۔ اس معاملے کی ایک انتہائی مثال یہ ہے کہ ایک بار آپ کے مخالفوں نے پتھر مار کر آپ کو زخمی کر دیا، اُس وقت آپ کی زبان

سے یہ الفاظ نکلے: اللہُمَّ اھْدِ قَوْمِي فَإِنَّہُمْ لَا يَعْلَمُونَ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 1375)۔ خدایا! میری قوم کو ہدایت دے، کیوں کہ وہ جانتے نہیں۔

یک طرفہ صبر اور خیر خواہی کا طریقہ جو آپ نے عرب میں اختیار فرمایا، وہ اسی لیے تھا کہ فریقِ ثانی کے بارے میں آپ، یا آپ کے ساتھیوں کے دل میں شکایت اور نفرت کی نفسیات پیدا نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ جو ذہن شکایت اور نفرت لیے ہوئے ہو، وہ اصلاح کا کام درست طور پر نہیں کرسکتا۔

خاموش تبلیغ

ایسی حالت میں پیغمبر اسلام کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا۔ ایک یہ کہ لوگوں کو کھُلے طور پر توحید کی طرف بلائیں اور کھلے طور پر شرک کو غلط قرار دیں۔ آپ کے لیے دوسرا انتخاب یہ تھا کہ آپ خاموشی کے ساتھ انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے اپنا مشن شروع کریں اور حالات کا اندازہ کرتے ہوئے تدریجی طور پر آگے بڑھیں۔ پہلے طریقے میں متشددانہ ٹکراؤ کا اندیشہ تھا، اس لیے آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس کے بجائے آپ نے دوسرے طریقے کو اختیار کیا، جو واضح طور پر امن کا طریقہ تھا۔ جس میں یہ ممکن تھا کہ لوگوں سے ٹکراؤ کی صورتِ حال پیدا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا جاسکے۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں یہ پیس فل ایکٹوزم کی پہلی مثال تھی۔ اسی طرح آپ نے اپنی پوری تحریک امن کے اصول پر چلائی۔ اسی حقیقت کو ایک حدیث میں آپ نے اس طرح فرمایا: لاَ تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ العَدُوِّ، وَسَلُوا اللَّهَ العَافِيَةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2965)۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کسی دشمن کا سامنا پیش آئے تو ایسا نہ کرو کہ ردِّ عمل کی نفسیات میں مبتلا ہوکر اس سے لڑ جاؤ، بلکہ امن کے اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے دشمنی کے مسئلے کو حل کرو:

Solve the problem of enmity by following the peaceful method.

اس طرح آپ پُرامن انداز میں کام کرتے رہے یہاں تک کہ دھیرے دھیرے 83 آدمی آپ کے مشن میں شامل ہوگئے۔ اُس وقت آپ کے ایک سینئر ساتھی ابوبکر صدیق بن ابی قحافہ نے

کہا کہ اب ہم کو اعلان کے ساتھ کھُلے عام اپنا کام کرنا چاہیے۔ پیغمبر اسلام نے کہا: اے ابوبکر! ابھی ہم تھوڑے ہیں (یَا أَبَا بَكْرٍ إِنَّا قَلِيلٌ)۔لیکن ابوبکر صدیق نے اس کے باوجود ایسا کیا کہ وہ کعبہ میں گئے اور وہاں بلند آواز سے اعلان کرکے لوگوں کو بتایا کہ میں پوری طرح محمد کا ساتھی بن گیا ہوں۔ یہ سُن کر مخالفین کی ایک جماعت دَوڑ کر آئی۔ وہ آپ کو مارنے پیٹنے لگی۔ انھوں نے آپ کو اتنا زیادہ مارا کہ آپ زخمی ہوکر گر پڑے۔ مارنے والوں نے ابوبکر صدیق کو صرف اُس وقت چھوڑا جب کہ انھوں نے سمجھا کہ اب ان کا خاتمہ ہو چکا ہے (سیرت ابنِ کثیر، جلد 1، صفحہ 439)۔

عمر بن الخطّاب آپ کے ساتھیوں میں نہایت طاقتور شخص تھے۔ انھوں نے بھی پیغمبر اسلام سے کہا کہ ہم حق پر ہیں، پھر ہم کیوں خاموش رہیں۔ ہم اعلان کے ساتھ کھُلے طور پر اپنا کام کریں گے۔ یہ سُن کر پیغمبر اسلام نے فرمایا: يَا عُمَرُ إِنَّا قَلِيلٌ قَدْ رَأَيْتَ مَا لَقِينَا (سیرت ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 441)۔یعنی اے عمر! ہم تھوڑے ہیں، ابوبکر کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تم نے دیکھ لیا۔

دھیرے دھیرے پیغمبر اسلام کا مشن پھیلنے لگا۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ پھر وہ وقت آیا جب کہ مدینہ سے 73 آدمی آکر آپ سے ملے، اور بتایا کہ ہم آپ کے مشن میں آپ کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب آپ مکّہ والوں کی زیادتی کو اور زیادہ برداشت نہ کیجیے۔ ہم کو اجازت دیجیے کہ ہم مکّہ والوں کے خلاف جہاد کریں۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا: اصْبِرُوا فَإِنِّي لَمْ أُومَرْ بِالْقِتَالِ (المواهب اللدنية بالمنح المحمدية، جلد 1، صفحہ 199)۔یعنی تم لوگ صبر کرو، کیوں کہ مجھے لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام کی یہ روش بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ عملی نتیجے کو سامنے رکھتے تھے۔ اُن کا یہ ماننا تھا کہ اقدام کو مثبت نتیجے کا حامل ہونا چاہیے، ایسا اقدام جو کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter-productive) ثابت ہو، وہ کوئی اقدام نہیں۔ وہ نتیجہ خیز اقدام (result-oriented action) کے حامی تھے۔

پیغمبر اسلام کی لائف بتاتی ہے کہ ان کی اسکیم میں اُس قسم کی چیز کے لیے کوئی جگہ نہ تھی، جس کو موجودہ زمانے میں خودکُش بمباری (suicide bombing) کہا جاتا ہے۔ خودکُش بمباری

کیا ہے۔ وہ دراصل مایوسی کا آخری درجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے مخالف پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتا، اس لیے وہ یہ چاہنے لگتا ہے کہ فریقِ ثانی کو پریشان کرنے کی خاطر خود اپنے آپ کو ہلاک کرے اور پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کرلے کہ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میں شہید ہوجاؤں۔

دشمن کے مقابلے میں خودکش بمباری دراصل یہ ہے کہ آدمی کے سامنے پیس فل ایکشن کا انتخاب کُھلا ہوا ہو مگر نفرت اور انتقام کے جذبات میں مبتلا ہو کر وہ اس کو نقصان پہنچانے کے لیے اندھا ہوجائے اور اس اندھے پن میں وہ خود اپنے ہی کو ہلاک کرڈالے۔ کوئی بھی صورتِ حال جہاں کوئی شخص خودکُش بمباری کا چانس لیتا ہے، وہاں یقینی طور پر اس کے لیے پُرامن طریقِ کار کا راستہ کھلا ہوتا ہے۔ مگر وہ اس کو دیکھ نہیں پاتا۔

اصل یہ ہے کہ پُرامن طریقِ کار کا انتخاب کرنے کے لیے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ آدمی کا ذہن نفرت اور انتقام کے جذبات سے خالی ہو۔ وہ غیر متاثر انداز میں واقعات کا تجزیہ کرے۔ پیغمبر اسلام کے الفاظ میں، وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسا کہ وہ ہیں (أَرِنَا الْأَشْيَاءَ كَمَا هِيَ) تفسیر الرازی، جلد 1، صفحہ 119۔ پُرامن عمل ایک مثبت عمل ہے اور مثبت عمل کی اہمیت کو ایک مثبت ذہن ہی سمجھ سکتا ہے، اور اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرسکتا ہے۔

امن پسندانہ سوچ

پیس فل ایکٹوزم بظاہر ایک خارجی عمل ہے، مگر وہ مکمل طور پر ایک داخلی شعور کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ صرف پیس فل مائنڈ ہے جو پیس فل ایکٹوزم کی بات سوچ سکتا ہے اور اس کو درست طور پر عمل میں لاسکتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے اس حقیقت کو جانا۔ انھوں نے اس سلسلے میں یہ کیا کہ سب سے پہلے پیس فل مائنڈ بنایا۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہوسکے کہ پیس فل ایکٹوزم کے اصول پر اپنی تحریک چلاسکیں۔ اسی حقیقت کو آپ نے مذہبی زبان میں اس طرح بیان کیا ہے: جب آدمی کا دل درست ہوتا ہے تو اس کے تمام اعمال درست ہوجاتے ہیں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 52)۔

ذہن سازی کے اس عمل کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اہم کام یہ تھا کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرے (البقرہ، 2:129) ۔یعنی روح کی تطہیر (purification of the soul)۔اس تزکیہ کا طریقہ کیا تھا۔ یہ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِي قَلْبِهِ، فَإِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ، صُقِلَ قَلْبُهُ، وَإِنْ زَادَ زَادَتْ، حَتَّى يَعْلُوَ قَلْبَهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 7952) ۔یعنی مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک کالا دھبّہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے اور اس کو مٹا دے اور استغفار کرے تو اس کا دل دھبّے سے پاک ہوجاتا ہے۔ اور اگر دھبّے میں مزید اضافہ ہوتو وہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

اس حدیث میں پیغمبر اسلام نے ایک اہم نفسیاتی حقیقت بتائی ہے۔نفسیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے ذہن میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کے حافظے میں اس طرح محفوظ ہوجاتی ہے کہ پھر وہ کبھی نہیں نکلتی۔نفسیات کا مطالعہ مزید بتاتا ہے کہ انسانی ذہن کے دو بڑے خانے ہیں۔ ایک، شعور، اور دوسرا، لاشعور۔ جب کوئی بات انسانی ذہن میں آتی ہے تو وہ پہلے اس کے زندہ شعور کے خانے میں آتی ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ لاشعور کے خانے میں چلی جاتی ہے۔

ایک خانے سے دوسرے خانے میں جانے کا یہ عمل خاص طور پر رات کے وقت ہوتا ہے۔ اس طرح اگرچہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات جو آج زندہ حافظہ (active memory) میں ہے، بعد کو وہ دماغ کے پچھلے خانے میں جا کر بظاہر ایک بھولی ہوئی بات بن جاتی ہے۔ مگر جہاں تک شخصیتِ انسانی کا تعلق ہے، وہ لازمی طور پر اس کا جُزء بنتی رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شخصیتِ انسانی کا براہِ راست تعلق انسانی تھنکنگ سے ہے۔جیسی سوچ ویسی شخصیت۔

پیغمبر اسلام کے مذکورہ قول کا مطالعہ جدید نفسیاتی تحقیق کی روشنی میں کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قولِ رسول میں پیس فل تھنکنگ اور پیس فل ایکٹوزم کا اصل راز بتا دیا گیا ہے۔صحیح معنوں میں

وہی شخص پیس فل ایکٹوسٹ بن سکتا ہے جو مذکورہ قولِ رسول پر عمل کرے۔ اس عمل کو آج کل کی زبان میں ڈی کنڈیشننگ کہا جاسکتا ہے۔

ہر انسان اور ہر انسانی گروہ ایسے ماحول میں رہتا ہے جہاں ہر وقت ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے لیے ناخوش گوار ہوں، جو اس کے اندر فریقِ ثانی کے خلاف منفی احساسات پیدا کریں۔ اس طرح گویا ہر آدمی کے ذہن میں بار بار منفی نوعیت کے احساسات آتے رہتے ہیں۔ اگر آدمی اس منفی احساس کو فوری طور پر بدل کر مثبت احساس نہ بنائے تو وہ آگے بڑھ کر اس کے لاشعور میں ایک منفی آئٹم کے طور پر محفوظ ہوجائے گا۔ یہ عمل اگر بلا روک ٹوک جاری رہے تو آخر کار یہ ہوگا کہ اس کا لاشعور یا اس کا حافظہ منفی آئٹم سے بھر جائے گا۔ اور اس کے نتیجے میں اس کی پوری شخصیت، منفی شخصیت بن جائے گی۔ یہی وہ منفی شخصیت ہے جس کے حامل افراد دوسروں کے خلاف تشدد اور جنگ میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ تشدد دراصل منفی شخصیت کے خارجی اظہار کا دوسرا نام ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جب آدمی کے ذہن میں کوئی منفی احساس آئے تو اسی وقت وہ اس کو بدل کر مثبت احساس بنالے۔ جو آدمی اپنے اندر کنورزن کا یہ عمل جاری کرے اس کا یہ حال ہوگا کہ اس کا پورا لاشعور یا حافظہ مثبت آئٹم کا اسٹور بن جائے گا۔ اس کا فائدہ اس کو یہ ملے گا کہ اس کی شخصیت ایسی شخصیت بنے گی جو ہر قسم کے نیگیٹیو احساس سے خالی ہوگی۔ ایسا آدمی مکمل طور پر ایک پازیٹیو شخصیت کا حامل ہوگا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو پر امن ذہن میں جیتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو پیس فل ایکٹوزم کے اصول کے مطابق کوئی تحریک چلاسکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نفسیاتی (psychological) حقیقت کو سمجھا، اور تزکیہ، بالفاظ دیگر ایک ایک شخص پر ڈی کنڈیشننگ کا عمل جاری کرکے ایک سو ہزار سے زائد افراد کی ایک ٹیم بنائی۔ یہ وہ لوگ تھے جو پورے معنوں میں امن پسندی کا مزاج رکھتے تھے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ پیس فُل ایکٹوزم کے اصول کے مطابق عمل کرسکیں، اور امن کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک انقلاب لائیں۔

سوال وجواب

سوال

آپ کو لفظ "جہاد" کی تعریف میں کچھ لیف لیٹس روانہ کیے جارہے ہیں۔ غور اور صبر کے ساتھ پڑھ کر اس کا جواب دیں۔ ان کو پڑھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کو خدائی کتاب کہنے والا انسانیت کا دشمن ہے اور سرودھرم سمبھاؤ کا بھی دشمن ہے۔ (شیوا گوڑ، سنگاریڈی)

جواب

شیوا گوڑ صاحب نے اپنے اس خط کے ساتھ ہمیں انگریزی میں 41 صفحہ کی فوٹو کاپیاں بھیجی ہیں۔ اس کا جواب یہاں تحریر کیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنے خط میں قرآن کی 24 آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس طرح کی باتیں ہیں— ان سے لڑو، ان سے دوستی نہ کرو، ان کے ساتھ نرمی سے نہ پیش آؤ۔ ان کے خلاف جہاد کرو، وغیرہ۔

واضح رہے کہ قرآن کی یہ آیتیں جو آپ نے نقل کی ہیں وہ غیر مسلم کے ساتھ مسلمان کے تعلق کو نہیں بتاتیں۔ بلکہ وہ جنگ کرنے والوں کے ساتھ مسلمان کے تعلق کو بتاتی ہیں، اور جنگ کے معاملہ میں یہی ساری دنیا کا مسلمہ اصول ہے۔ ان آیتوں کی بنیاد پر آپ نے اسلام کے بارے میں جو شدید رائے قائم کی ہے، وہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ نے قرآن کی مذکورہ آیتوں کو عمومی معنوں میں لے لیا ہے۔ حالانکہ یہ آیتیں ہنگامی حالات کے لیے ہیں۔ یہ اس وقت کے لیے ہیں جب کہ مسلمانوں اور دوسری قوم کے درمیان حالت جنگ (state of war) قائم ہوگئی ہو، اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ حالت جنگ میں ہمیشہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ جہاں تک نارمل حالات میں لوگوں کے ساتھ مسلمان کے سلوک کا تعلق ہے وہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے جو قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔

ان دوسری آیتوں میں مسلمانوں کو تمام انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے (سورہ البلد، 90:17)۔ اسی طرح حکم ہے کہ درگزر (tolerance) کا

طریقہ اختیار کرو (سورہ الاعراف، 7:199)۔ اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَا يَضَعُ اللَّهُ رَحْمَتَهُ إِلَّا عَلَى رَحِيمٍ، قَالُوا :يَا رَسُولَ اللَّهِ، كُلُّنَا يَرْحَمُ، قَالَ : لَيْسَ بِرَحْمَةِ أَحَدِكُمْ صَاحِبَهُ يُرْحَمُ النَّاسُ كَافَّةً (مسند ابویعلیٰ الموصلی، حدیث نمبر 4258)۔ یعنی اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ اپنی رحمت صرف رحم کرنے والے پر کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا: ہم سب رحم کرتے ہیں، آپ نے کہا: تمھارا اپنے ساتھی پر رحم کرنا مراد نہیں ہے، تمام انسانوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک غیر مسلموں سے تعلق کا معاملہ ہے، قرآن میں اس کی بابت ایک بنیادی اصول مقرر کردیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے: لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (60:8-9)۔ یعنی اللہ تم کو ان لوگوں سے نہیں روکتا جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی۔ اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے بھلائی کرو اور تم ان کے ساتھ انصاف کرو۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ بس ان لوگوں سے تم کو منع کرتا ہے جو دین کے معاملہ میں تم سے لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔ اور تمہارے نکالنے میں مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو، اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

قرآن کی ان دونوں آیات کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے تم سے جنگ نہیں کیا ان سے تم کو بھلائی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ مگر جو لوگ تمھارے خلاف جنگی کارروائی کررہے ہیں، ان کے ساتھ بطور ڈیفنس جنگ کرو۔ قرآن کے مطابق، عام انسانوں کو تکلیف دینا سخت منع ہے، بلکہ عدو (enemy) اور مُقاتل (combatant) کے درمیان بھی فرق کرنا چاہیے۔ قرآن کا حکم یہ ہے کہ بظاہر اگر کوئی شخص یا گروہ تمہارا دشمن ہو تب بھی تم کو اس کے ساتھ اچھا تعلق قائم رکھنا چاہیے۔

جیسا کہ قرآن میں دوسرے مقام پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایک شخص اگر بظاہر تمہارا دشمن ہو تب بھی

تم اس کے ساتھ احسن طریقے پر معاملہ کرو، عین ممکن ہے کہ وہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)۔ یعنی بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو جنگ کی اجازت صرف اس وقت ہے جب کہ فریق مخالف کی طرف سے حملہ کا آغاز ہو چکا ہو۔ لیکن جو اس جنگ میں شامل نہیں ہیں، ان کو بالکل بھی تکلیف نہیں دی جائے گی، خواہ وہ دل میں دشمنی رکھتا ہو۔ بین اقوامی معاملات میں یہی مساویانہ سلوک ساری دنیا کا مسلمہ اصول ہے اور اسلامی شریعت میں بھی مساویانہ سلوک کے اسی اصول کو اختیار کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن بیک وقت ایک واحد کتاب کی صورت میں نہیں اترا۔ بلکہ وہ حالات کے اعتبار سے 23 سال کے دوران اترا۔ 23 سال کی اس مدت کو عمومی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک 20 سال، دوسرے 3 سال۔ 23 سالہ مدت نزول میں 20 سال گویا امن کے سال تھے اور تقریباً 3 سال جنگی حالات کے سال۔ آپ نے جن 24 آیتوں کا حوالہ دیا ہے وہ مذکورہ تقسیم کے مطابق 3 سال والے ایمرجنسی کے حالات میں اتریں۔ قرآن کی دوسری آیتیں 20 سال والی مدت میں اتریں اور وہ سب کی سب امن اور انصاف اور انسانیت جیسی مثبت تعلیمات پر مشتمل ہیں۔

سوال

قرآن میں کئی آیتیں ایسی ہیں جو مسلمانوں سے کہتی ہیں کہ کافروں کو قتل کرو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جہادی ہو گئے ہیں اور غیر مسلموں کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں یہ آیت ہے: وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ (2:191)۔ یعنی اور قتل کرو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔

اور فتنہ سخت تر ہے قتل سے۔ اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو۔ یہی سزا ہے کافروں کی۔

سوال یہ ہے کہ قرآن میں جب تک اس طرح کی آیتیں موجود ہیں تو مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ شانتی سے رہنا کیسے ممکن ہے۔ (اشوک سنگھل، نئی دہلی)

جواب

یہ آیت خود ہی یہ بتا رہی ہے کہ جنگ کا حکم کافر کے خلاف نہیں ہے بلکہ مقاتل (حملہ آور) کے خلاف ہے۔ جیسا کہ خود اسی آیت میں کہا گیا ہے: فَإِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ (پس اگر وہ جنگ چھیڑ دیں تو تم بھی دفاع میں اُن سے جنگ کرو)۔ اسی طرح مذکورہ آیت سے پہلے یہ آیت ہے: وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (2:190)۔ یعنی جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں اُن سے تم (دفاع میں) جنگ کرو، اور تم خود جارحیت (aggression) نہ کرو۔

چنانچہ قرآن اور پیغمبر اسلام کی سنت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ جائز ہے اور اُس کا اختیار بھی صرف حاکمِ وقت کو حاصل ہوتا ہے، کسی غیر حکومتی گروہ کو مسلح جد جہد (armed struggle) کی ہرگز اجازت نہیں۔ اسی طرح اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قتال (جنگ) کا حکم ایک عارضی (temporary) سبب کے لیے ہے، وہ اسلام کا کوئی ایسا حکم نہیں ہے، جو ہر لمحہ جاری رہے۔ جب دفاع کا سبب ختم ہو جائے تو جنگ کا حکم بھی عملاً موقوف (suspend) ہو جائے گا، یعنی جب امن کا زمانہ ہو تو جنگ نہیں کی جائے گی۔ یہی اسلام کی ابتدائی تاریخ میں پیش آیا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں، ماضی کے تسلسل (continuation) کے تحت جنگ کی صورت پیش آئی۔ یعنی انھوں نے پیغمبر اسلام کے خلاف ناحق جنگ چھیڑ دی اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفاعی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ مگر جنگ کا یہ حکم عارضی تھا۔ قرآن کے الفاظ میں، جب فریقِ مخالف نے اپنا اوزار (ہتھیار) رکھ دیا تو جنگ کا خاتمہ ہو گیا (محمد، 47:4)۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ قرآن میں جن چند مقامات پر کافر کا لفظ آیا ہے، اُس سے

پیغمبر اسلام کے زمانے کے انکار کرنے والے مراد ہیں۔ قرآنی اصطلاح کے مطابق، ایسا نہیں ہے کہ لفظ کافر ابد تک کے لیے ہر غیر مسلم گروہ کے لیے بولا جائے گا، یعنی کافر کسی قوم کا یا نسل کا دائمی لقب نہیں ہے۔ چنانچہ اہل اسلام نے بعد کے زمانہ کے لوگوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے وہ کافر یا کفار نہ تھے بلکہ یہ وہی الفاظ تھے جو کہ قومیں خود اپنے لیے استعمال کر رہی تھیں۔ مثلاً ہنود، یہود، نصاریٰ، مجوس، بودھ (بوذا) وغیرہ۔ اسلامی اصول کے مطابق، کسی قوم کو اسی لفظ سے پکارا جائے گا جو لفظ اُس نے خود اپنے لیے اختیار کیا ہو۔

قرآن کے مطابق، پیغمبروں نے جب اپنے زمانہ کے غیر مومن لوگوں کو پکارا تو اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ اے کافرو، بلکہ یہ کہا کہ اے میری قوم کے لوگو۔ چنانچہ قرآن میں پیغمبر کی زبان سے پچاس بار یہ الفاظ آئے ہیں: يَاقَوْمِ (اے میری قوم)۔ اسی طرح قرآن میں پیغمبروں کے ہم زمانہ غیر مومنین کو اُن کی قوم کا نام دیا گیا ہے۔ مثلاً: قوم لوط، قوم صالح، قوم ہود، قوم نوح، وغیرہ۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک پیغمبر کو اُس کے مخالفین نے پتھر مارا اور ان کی پیشانی سے خون بہنے لگا، اُس وقت پیغمبر کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي، فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (مسند احمد، حدیث نمبر 4057)۔ اے میرے رب، میری قوم کو معاف کر دے کیوں کہ وہ لوگ نہیں جانتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کا نظریہ دوقومی نظریہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک قومی نظریہ تھا۔ یعنی جو قومیت پیغمبر کی تھی وہی قومیت پیغمبر کے مخاطبین کی تھی۔ پیغمبر اور اُس کے مخاطبین کے درمیان جو فرق تھا، وہ قومیت کا فرق نہ تھا بلکہ عقیدہ اور مذہب کا فرق تھا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (109:6)۔ یعنی تمہارے لیے تمہارا دین، اور میرے لیے میرا دین۔

قرآن میں الانسان (واحد) کا لفظ 65 بار آیا ہے، اور الناس (جمع) 240 بار آیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کافر کا لفظ صرف پانچ بار قرآن میں آیا ہے اور اُس کی جمع الکفار، الکافرون اور الکافرین کے الفاظ 150 بار آئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں قرآن کا تصور کیا ہے۔ قرآن کی نظر میں یہ زمین دار الانسان ہے، نہ کہ دار الحرب (جنگ کا میدان)۔

اعلان

انسانیت کی تعمیر میں خواتین کا ایک اہم رول ہے۔ مگر پوری تاریخ میں ان کو انڈر یوٹیلائز (underutilize) کیا گیا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اسلامی تاریخ میں خواتین کے رول کو دریافت کیا، مثلاً حضرت ہاجرہ اور حضرت خدیجہ، وغیرہ۔ اور اس کو ایکسپلین کر کے موجودہ دور کی خواتین کو بتایا کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلیں، اور اپنے پوٹنشل کو ایکچولائز کر کے اس تاریخ کو دہرائیں، جو تاریخ اُن خواتین نے بنائی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے قرآن وسنت اور تاریخ کے حوالے سے کئی کتابیں لکھی ہیں، جیسے ''عورت معمارِ انسانیت''، ''خاتون اسلام''۔ اب ان کی رہنمائی میں سی پی ایس لیڈیز نے ایک دعوتی گروپ شروع کیا ہے جس کا نام ہے:

CPS Ladies International

اس گروپ میں انڈیا اور انڈیا کے باہر کی خواتین شامل ہیں۔ یہ گروپ 29 اکتوبر 2020 کو شروع ہوا، اور اتنے کم وقت میں خواتین نے جو فیڈ بیک دیا، وہ بہت ہی حیرت انگیز (amazing) ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی زندگی میں مثبت تبدیلی آئی۔ انھوں نے اس گروپ کو جوائن کر کے حقیقی اسلام کو سمجھا ہے۔ اس سے پہلے ان کے نزدیک اسلام کا مطلب کچھ سماجی رسوم تھا، نہ کہ وہ اسلام جو اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے بھیجا ہے۔

اس وقت ہماری دو ہفتہ وار آن لائن قرآن کلاسیں جاری ہیں:

Urdu Talk by Ms Fahmida Khan - Every Wednesday at 7 pm (IST)
English Quran Class by Ms Fathima Sarah - Every Sunday at 7 pm (IST)
@ www.facebook.com/cpsinternational

سی پی ایس لیڈیز انٹرنیشنل سے اگر کوئی خاتون جڑنا چاہتی ہیں تو نیچے دیے گئے ای میل وغیرہ پر اپنا نام اور نمبر بھیجیں:

fahmidakhan245@gmail.com

واٹس ایپ: 09453215285

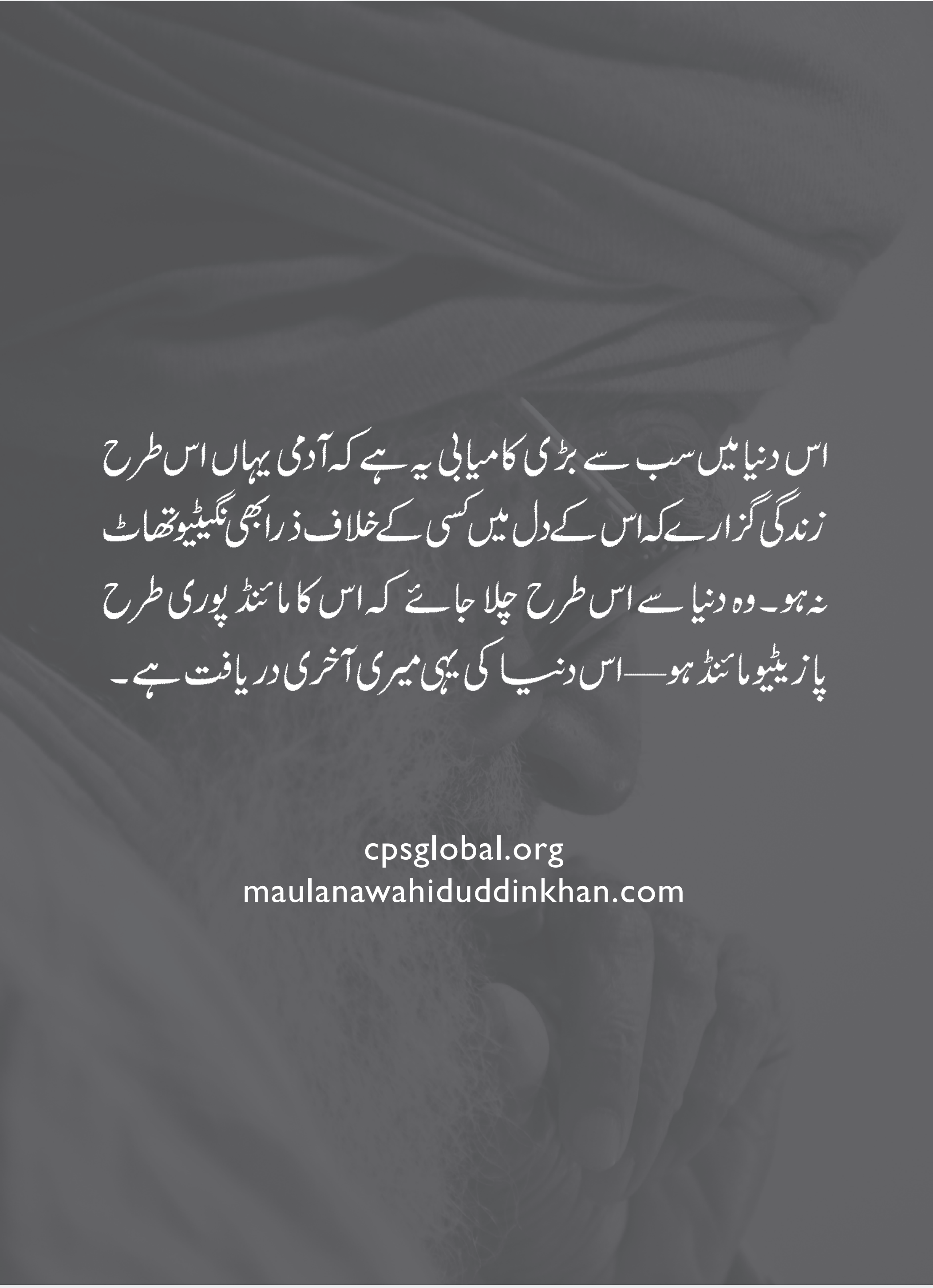
Telegram channel: https://t.me/joinchat/_6an7cUFeOU1MjA1
CPS Ladies FB group link: www.facebook.com/groups/cpsladies

مولانا وحید الدین خاں کی کتابیں رعایتی قیمت پر دستیاب ہیں

₹ 30	Aakhri Safar	آخری کا سفر
₹ 10	Aakhirat ka Safar	آخرت کا سفر
₹ 50	Ahya-e-Islam	احیائے اسلام
₹ 60	Al-Islam	الاسلام
₹ 70	Al-Rabbaniah	الربانیہ
₹ 70	Amne-Aalam	امن عالم
₹ 60	Aqliat-e-Islam	عقلیات اسلام
₹ 100	Asbaq-e-Tarikh	اسباقِ تاریخ
₹ 140	Asfar-e-Hind	اسفارِ ہند
₹ 10	Asma e Husna	اسمائے حسنی
₹ 60	Azmat-e-Islam	عظمتِ اسلام
₹ 60	Azmat-e-Islam	عظمتِ اسلام - بُک لٹ
₹ 20	Azmat-e-Momin	عظمتِ مومن - بُک لٹ
₹ 60	Azmat-e-Qur'an	عظمتِ قرآن
₹ 30	Azmat-e-Sahaba	عظمتِ صحابہ
₹ 50	Dawat-e-Haq	دعوتِ حق
₹ 70	Dawat-e-Islam	دعوتِ اسلام
₹ 10	Dawat Ilallah	دعوت الی اللہ
₹ 30	Deen ki Siyasi Taabeer	دین کی سیاسی تعبیر
₹ 20	Deen Kiya Hai?	دین کیا ہے؟
₹ 100	Deen wa Shari'at	دین وشریعت
₹ 90	Deen-e-Insaniyat	دینِ انسانیت
₹ 100	Deen-e-Kamil	دینِ کامل
₹ 30	Deeni Taaleem	دینی تعلیم
₹ 100	Diary Vol. I 83-84	ڈائری (حصہ اول)
₹ 120	Diary 89-90	ڈائری - 1989-90
₹ 100	Diary 91-92	ڈائری - 91-92
₹ 20	Fikr-e-Islami	فکر اسلامی
₹ 40	Hadees-e-Rasool	حدیثِ رسول
₹ 20	Hajj ka Paigam	حج کا پیغام
₹ 40	Hal Yahan Hai	حل یہاں ہے
₹ 30	Haqeeqat Ki Talaash	حقیقت کی تلاش
₹ 50	Haqeeqat-e-Hajj	حقیقتِ حج
₹ 10	Haqeeqat-e-Tawhid	حقیقتِ توحید - بُک لیٹ
₹ 100	Hikmat-e-Islam	حکمتِ اسلام
₹ 90	Hind-Pak Diary	ہند-پاک ڈائری
₹ 10	Hindustan Aazadi Ke Baad	ہندستان آزادی کے بعد
₹ 70	Hindustani Musalman	ہندستانی مسلمان
₹ 30	Imani Taqat	ایمان کی طاقت
₹ 60	Insaan ki Manzil	انسان کی منزل
₹ 60	Islam aur Asre Hazir	اسلام اور عصرِ حاضر
₹ 50	Islam Daur-e-Jadid Ka Khaliq	اسلام دورِ جدید کا خالق
₹ 30	Islam Deen-e-Fitrat	اسلام دینِ فطرت
₹ 10	Islam Ek Azeem Jad-o-Jahad	اسلام ایک عظیم جدو جہد
₹ 10	Islam Ka Taaruf	اسلام کا تعارف
₹ 30	Islam Kiya Hai?	اسلام کیا ہے؟
₹ 90	Islam: Ek Ta'aruf	اسلام: ایک تعارف
₹ 30	Islami Dawat	اسلامی دعوت
₹ 10	Islami Jihad	اسلامی جہاد
₹ 60	Islami Taalimaat	اسلامی تعلیمات
₹ 60	Islami Zindagi	اسلامی زندگی
₹ 30	Ittehad-e-Millat	اتحادِ ملّت
₹ 230	Izhaar-e-Deen	اظہارِ دین
₹ 80	Karwan-e-Millat	کاروانِ ملّت
₹ 30	Khaleej-e-Diary	خلیج ڈائری
₹ 30	Khoda aur Insaan	خدا اور انسان

₹ 60	Socialism Aur Islam	سوشلزم اور اسلام
₹ 10	Taareekh Dawat-e-Haq	تاریخ دعوتِ حق
₹ 20	Taaruf-e-Islam	تعارف اسلام
₹ 30	Tablighi Tahreek	تبلیغی تحریک
₹ 40	Tajdeed-e-Deen	تجدید دین
₹ 10	Talaq Islam Mein	طلاق اسلام میں
₹ 90	Tameer-e-Hayat	تعمیرِ حیات
₹ 70	Tameer-e-Insaniyat	تعمیرِ انسانیت
₹ 30	Tameer-e-Millat	تعمیرِ ملّت
₹ 30	Tareekh Ka Sabaq	تاریخ کا سبق
₹ 100	Tasweer-e-Millat	تصویرِ ملّت
₹ 40	Tarjuma-e-Quran	ترجمہ قرآن
₹ 10	Tazkiya-e-Nafs	تزکیہ نفس
₹ 30	Ummahat-ul-Mumeneen	امہاتُ المؤمنین
₹ 30	Zalzal-e-Qiyamat	زلزلہ قیامت
₹ 60	Zuhoor-e-Islam	ظہورِ اسلام
₹ 80	Arabic version of God Arises	الاسلام یتحدی
₹ 40	Tarbiyat-e-Aulad	تربیتِ اولاد
₹ 10	Mansoobaband Amal	منصوبہ بند عمل
₹ 100	Sawal Wa Jawab	سوال وجواب
₹ 50	Marxism: Tareekh Jisko Radd Kar Chuki Hai	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
₹ 80	Masa'le Ejtehaad	مسائل اجتہاد
₹ 20	Islam Pandrahwin Sadi Mein	اسلام پندرہویں صدی میں
₹ 30	Taameer Ki Taraf	تعمیر کی طرف

₹ 10	Manzil Ki Taraf	منزل کی طرف
₹ 10	Maqsad-e-Hayat	مقصدِ حیات
₹ 60	Mazameen-e-Islam	مضامینِ اسلام
₹ 70	Mewat Ka Safar	میوات کا سفر
₹ 70	Mutala-e-Seerat	مطالعہ سیرت
₹ 20	Mutala-e-Seerat	مطالعہ سیرت - بُک لیٹ
₹ 30	Nar-e-Jahannam	نارِ جہنم
₹ 80	Nashri Taqriren	نشری تقریریں
₹ 30	Iama aur Daure Jadid	علماء اور دورِ جدید
₹ 10	Paighambar-e-Islam	پیغمبرِ اسلام
₹ 80	Qalallah Qallar Rasool	قال اللہ، قال الرسول
₹ 30	Qiyadat Nama	قیادت نامہ
₹ 10	Qiyamat ka Alarm	قیامت کا الارم
₹ 30	Qur'an Ka Matloob Insan	قرآن کا مطلوب انسان
₹ 60	Rah-e-Amal	راہِ عمل
₹ 30	Rahen Band Nahin	راہیں بند نہیں
₹ 30	Rahnuma-e-Hayat	رہنمائے حیات (کتابچہ)
₹ 70	Rahnuma-e-Hayat	رہنمائے حیات
₹ 20	Roshan Mustaqbil	روشن مستقبل
₹ 30	Sabaq Aamoz Waqiat	سبق آموز واقعات
₹ 10	Sachcha Rasta	سچّا راستہ
₹ 50	Safarnama Spain wa Falasteen	سفرنامہ اسپین و فلسطین
₹ 80	Safar-e-Hayat	سفرِ حیات
₹ 30	Saum-e-Ramzan	صومِ رمضان
₹ 70	Shatme Rasool Ka Masla	شتمِ رسول کا مسئلہ
₹ 70	Sirat-e-Mustaqeem	صراطِ مستقیم
₹ 30	Socialism: Ek Ghair Islami Nazaria	سوشلزم: ایک غیر اسلامی نظریہ



اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آدمی یہاں اس طرح
زندگی گزارے کہ اس کے دل میں کسی کے خلاف ذرا بھی نگیٹیو تھاٹ
نہ ہو۔ وہ دنیا سے اس طرح چلا جائے کہ اس کا مائنڈ پوری طرح
پازیٹیو مائنڈ ہو — اس دنیا کی یہی میری آخری دریافت ہے۔

cpsglobal.org
maulanawahiduddinkhan.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
Published on the 1st of every month
RNI 28822/76
Posted at NDPSO
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23